اسرار و رموز

مترجمہ عبدالرشید فاضل و کوکب شادانی

اقبال اکادمی پاکستان

دانائے راز

بسلسلۂ صد سالہ جشنِ ولادت حکیم الامّت علامّہ اقبالؒ

نومبر ۱۹۷۷ء

اسرار و رموز

منظوم اُردو ترجمہ

اسرار و رموز

از

عبدالرشید فاضل و کوکبؔ شادانی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طبع اوّل ——————— ۱۹۷۶ء
تعداد ——————— ۱۱۰۰
قیمت ——————— -/۲۰ روپے

— ناشر —

ڈاکٹر محمد معزّ الدین

ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان

۹۰ / بی ـــ ۲ ، گلبرگ ۳ ، لاہور

— مطبع —

پرنٹ آرٹس

مدنی مارکیٹ ، ۳۰ ریلوے روڈ ، لاہور

اقبالؔ

اسرارِ خودی

مترجم
عبد الرشید فاضل

تعارف

کسی دوسری زبان کے مضامین و مطالب کو کسی اور زبان میں منتقل کرنا نہایت دقت طلب امر ہے۔ خصوصاً جب کہ مضامین فلسفیانہ نازک خیالی کے ساتھ زبان شعر میں ادا ہوئے ہوں اور اس کا ترجمہ بھی شعروں میں کیا جا رہا ہو تاہم فاضل مترجمین نے علامہ اقبال کی معرکۃ الآراء تصنیف اسرار و رموز کا منظوم ترجمہ پیش کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی کتاب اسرار و رموز کا فارسی زبان سے اردو میں یہ ترجمہ ہمارے اشاعتی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ جو اقبال اکادمی پاکستان دانائے راز کے فکر و پیغام کی ترویج و تفہیم کے لئے کر رہی ہے۔ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں اور اردو ہماری قومی زبان ہے۔ چنانچہ اسرار و رموز جیسی اہم کتاب کا اردو میں ترجمہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔

اسرار و رموز کے حصہ اسرار خودی کا ترجمہ جناب عبدالرشید فاضل اور رموز بیخودی کا ترجمہ جناب کوکب شادانی نے کیا ہے ہم اسے ایک ساتھ اس لئے شائع کر رہے ہیں تاکہ اسرار خودی، جو کہ خودی کے مفاہیم و مطالب کی توضیح اور رموز بیخودی جو کہ فلسفۂ خودی کی سماج میں اطلاقی کیفیت کی آئینہ دار ہے، کا تسلسل قائم رہے جس طرح شکوہ اور جواب شکوہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح رموز بیخودی کو بھی اسرار خودی سے الگ کرنے سے فکر اقبالؒ کے اعجاز سخن سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین، نہ صرف ان تراجم کو پسند فرمائیں گے، بلکہ ان کے بارے میں اپنی رائے سے بھی ہمیں مطلع فرمائیں گے۔ تاکہ ان آراء کی روشنی میں خوب سے خوب تر کی کوشش کی جا سکے۔

ناشر

پیش لفظ

مثنوی "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہو [illegible] کتاب ہے جو یورپ اور امریکہ میں اقبال کی شہرت کا سبب بنی۔ ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو ان ممالک میں اس پر ریویو لکھے گئے اور اس طرح یورپ اور امریکہ کو اقبال کے افکار سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اب تک اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اس مثنوی کی اشاعت کے کے بعد سے ان کو ایک فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس لئے کہ اس مثنوی میں انہوں نے اپنے "فلسفۂ خودی" کو ایسی دلنشیں ترتیب اور ایسے مفکرانہ انداز میں پیش کیا ہے جو ایک شاعر کے انداز فکر سے بالکل مختلف ہے۔ شاعر کی فکر میں یہ ترتیب، یہ باقاعدگی اور یہ استدلالی شان کہاں ہوتی ہے! انہوں نے خود بھی فرمایا کہ ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست - بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسنِ اندازِ بیاں از من مجو ! - خوان رو اصفہاں از من مجو !

یوں تو اقبال کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کی اس قدر بہتات ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ہو، پھر افکار کا یہ تنوع اور خیالات کی یہ گونا گونی تو اقبال کے سوا کہیں مل ہی نہیں سکتی۔ مگر ان کی شہرت کو جس فلسفے نے پر پرواز لگائے وہ یہی فلسفۂ خودی ہے۔

بہر حال اس موقعے پر فلسفۂ خودی پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ چند سطریں بطور تمہید کے حوالۂ قلم کی ہیں۔ ترجمے کے بارے میں گذارش ہے کہ جب میں نے اسرار خودی کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کتاب، اگرچہ مختصر ہے، مگر بڑی جامع ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اسے پڑھیں اور سمجھیں بلکہ اس کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ اس خیال نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کا منظوم اردو ترجمہ کروں تاکہ یہ خیالات فارسی سے اردو میں منتقل ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ عام ہوسکیں۔ اس لئے کہ یہ خیالات ایسے ہی ہیں کہ ان کو قوم میں زیادہ سے زیادہ جاری و ساری ہونا چاہیئے۔ لہٰذا یہ عام فہم اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ یہ دعویٰ کرنا کہ میں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے بہت بڑا بول ہوگا۔ ویسے بھی بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے۔

"یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں ہے کہ ایک زبان کی نظم کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ جس طرح ایک قالب کی روح دوسرے پیکر میں نہیں پھونکی جاسکتی اس طرح ایک زبان کی نظم کو دوسری زبان کے قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ کیونکہ اس طریقے سے زبان کی مقامی لطافت کا مزہ جاتا رہتا ہے۔"

تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ترجمہ بھی جس دقّت و کاوش سے ہوا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی دفعہ اس کام سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جس نیت سے یہ کام شروع کیا گیا تھا وہ نیک تھی اور خود نمائی و جلب منفعت کے جذبے سے پاک اس لئے توفیقِ الٰہی نے ساتھ نہ چھوڑا اور جس قلم نے بسم اللہ لکھی تھی آخر اسی نے تمّت تک لکھ کر دم لیا۔

فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنا اور پھر نظم کا نظم میں اس لئے بھی مشکل ہے کہ فارسی کا ایک فقرہ کبھی کبھی ایک پوری عبارت کا مضمون ادا کر دیتا ہے، ایک مصرع میں بعض اوقات معانی و مطالب

کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ اردو میں یہ بات کہاں! اس کے علاوہ زبانِ فارس کی شیرینی اور خیالات عالیہ کے بیان کرنے کی قابلیت بھی مسلّمہ ہے۔ جیساکہ خود اقبال فرماتے ہیں۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است . طرزِ گفتار دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت ۔ خامۂ من شاخ نخل طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام ۔ درخورد با فطرت اندیشہ ام

پس ان گوناگوں مشکلات کے ہوتے ہوئے اگر ترجمہ میں وہ دلربائی نظر نہ آئے جو اصل کے ایک حرف میں موجود ہے تو مجھے معذور سمجھا جائے۔

ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصل کتاب کے الفاظ اور فقروں ہی سے ترجمہ کیا جائے۔ اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ جو تاثیر حضرت علامہ کے الفاظ میں ہے وہ دوسرے الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ دوسرا یہ کہ ان افکار عالیہ کے بیان کرنے کی قابلیت بھی جو ان الفاظ میں ہے دوسرے الفاظ میں کیوں کر ہو سکتی ہے کہ یہ الفاظ ایک مفکر کے علم و مشاہدہ اور تفحص کا نتیجہ ہیں۔ ہاں ایک بات میں نے اپنی طرف سے کی ہے وہ یہ کہ اسرار خودی کی بحر کے بجائے ایک رکن کے اضافے سے ایک دوسری ہی بحر میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے یہ آسانی ہو گئی کہ ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں ہو گیا۔ البتہ جہاں زبان نے ساتھ نہیں دیا اور فارسی الفاظ اور محاورات کا اردو میں مترادف لفظ اور محاورہ مل گیا تو اصل الفاظ کے چھوڑ دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ ان تمام رعائتوں، احتیاطوں اور امکانی کوششوں کے باوجود بھی اس بات کا مکرر اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے جواہر گراں بہا کے پہلو میں خزف ریزوں کو جگہ دی ہے اور جام جہاں نما کے مقابلے میں جام سفال کو پیش کیا ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ گلہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

سید عبد الرشید فاضل

جون ۱۹۷۶ء

فہرس

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	ترجمہ	۱
۲	تمہید	۲
۳	اس بیان میں کہ نظام عالم الخ	۱۱
۴	اس بیان میں کہ حیات خودی الخ	۱۴
۵	اس بیان میں کہ خودی جب عشق و محبت الخ	
۶	اس معنی میں کہ نفی خودی کا الخ	۳۰
۷	مرحلۂ اوّل۔ اطاعت	۳۹
۸	مرحلۂ دوم۔ ضبط نفس	۴۱
۹	مرحلۂ سوم۔ نیابت الٰہی	۴۳
۱۰		
۱۱	اسمائے علی مرتضیٰ رض الخ	۴۶
۱۲	حکایت ایک نوجوان مروزی کی الخ	۵۱
۱۳	حکایت اس پرندے کی الخ	۵۴
۱۴	حکایت الماس و زغال	۵۶
۱۵	شیخ و برہمن کی حکایت الخ	۵۸
۱۶	میر نجات نقش بند کی نصیحت الخ	۶۵
۱۷	الوقت سیف	۷۱
۱۸	دُعا	۷۷

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

ترجمہ

کل شہر میں چراغ لئے پھر رہا تھا شیخ
کہتا تھا ناکسوں میں اک انساں کی ہے تلاش
دِل بُجھ گیا ہے سُست رفیقانِ راہ سے
شیرِ خدا و رستمِ دستاں کی ہے تلاش
میں نے کہا کہ ڈھونڈ کے ہم تھک رہے اُسے
کہنے لگا کہ ایسے ہی انساں کی ہے تلاش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ترجمہ) اسرارِ خودی

تمہید

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم
(نظیری نیشاپوری)

ترجمہ

مرے جنگل کے خشک و تر میں ہر اک چیز ممکن ہے
بنا لیتا ہوں سولی، جو شجر منبر نہیں بنتا

کاروانِ شب جو لوٹا مہر عالم تاب نے
چھینٹے مارے گُل پہ، میرے گریۂ بیتاب نے
چشم نرگس سے، مرے اشکوں نے، دھویا خواب کو
اور کہا سبزے سے نالوں نے کہ اب بیدار ہو

باغباں نے آزمایا جب مرا زورِ کلام — بویا اک مصرع، ہلی حاصل ہیں تیغِ سبز فام

میرے ہی اشکوں کے دانوں کو چمن میں بو دیا — میرا تارِ نالہ صرفِ کسوتِ گلشن ہوا

ذرّہ ہوں پر میرے قبضے میں ہے خورشیدِ جہاں — ہیں ہزاروں صبح رکھتا ہوں گریباں میں نہاں

جامِ جم سے بھی کہیں روشن یہ میری خاک ہے — رازہائے بطنِ گیتی کا مجھے ادراک ہے

باندھتی ہے فکر وہ آہو مرے فتراک سے — جو ابھی باہر نہ آیا نیستی کی خاک سے

جو اُگا سبزہ نہ اب تک، وہ مرے گلشن میں ہے — شاخ پر جو گل نہ آیا، وہ مرے دامن میں ہے

میں ہوا تارِ رگِ عالم پہ جب مضراب زن — درہم و برہم ہوئی رامشگری کی انجمن

سازِ فطرت ہے زمانے میں مرا نادر نوا — ہمنشیں نغموں سے میرے کس طرح ہوں آشنا

عالمِ امکاں میں اک خورشیدِ نوزائیدہ ہوں — رسمِ دنیا اور آئینِ فلک نادیدہ ہوں

میری جولانی نہ دیکھی چشمِ انجم نے ابھی — بند ہے ابتک مرے سیماب میں آشفتگی

بحر کو میری ضیا کے رقص سے بہرا نہیں — کوہ کو رنگِ حنا میرا سا مل سکتا نہیں

یہ جہاں ناآشنا ہے میرے محسوسات سے — ڈر رہا ہوں اسلئے میں اُن کو دکھلاتے ہوئے

مطلعِ خاور سے جب پیدا ہوئی میری سحر
شبنم نو سے ہوئے گلہائے عالم تازہ تر

انتظارِ صبح خیزاں کرتے کرتے تھک گیا
کاش پیدا ہو کوئی زرتشت میری آگ کا!

نغمہ ہوں لیکن ابھی زخمے سے بے پردہ ہوں میں
حال میں گویا نوائے شاعرِ فردا ہوں میں

یہ زمانہ محرمِ اسرار ہو سکتا نہیں
میرا یوسف رونقِ بازار ہو سکتا نہیں

میرے مطالب کے نہیں میرے رفیقانِ قدیم
مضطرب ہے طور میرا بہرِ دیدارِ کلیم

قلزم احباب ہے مانندِ شبنم بے خروش
میری شبنم مثلِ بحرِ بیکراں، طوفان بدوش

میرا نغمہ ہے جہاں کا، وہ جہاں ہی اور ہے
اس درائے کارواں کا کارواں ہی اور ہے

سینکڑوں شاعر ہیں ایسے، مر کے جو زندہ ہوئے
اپنی آنکھیں بند کیں اور ہم کو بینا کر گئے

مر گئے جب وہ تو شمع بزمِ دوراں ہو گئے
صورتِ گل خاک سے اپنی نمایاں ہو گئے

گرچہ اس صحرا سے گذرے ہیں ہزاروں قافلے
مثلِ گامِ ناقہ لیکن وہ بہت خاموش تھے

عاشقِ صادق ہوں اور فریاد ہے ایماں مرا
شورِ محشر پیشِ خدمت ہے مرے ہنگامے کا

نغمۂ شوریدہ یارب تار کے بس کا نہیں
ٹوٹ جائے ساز میرا اس سے میں ڈرتا نہیں

قطرہ، بہتر ہے مرے سیلاب سے بیگانہ ہو
ہو سمندر ہی کوئی، اس کا اگر دیوانہ ہو

ظرفِ جو، میں کب ہے وسعت بحرِ عماں کے لیے
وقف ہو جائیں سمندر میرے طوفاں کے لیے

وسعتِ گلزار جس غنچے کے داماں میں نہیں
وہ مرے ابرِ بہاری کے لیے شایاں نہیں

پالتی ہے بجلیوں کو میری جانِ ناتواں
میری جولانگاہ کا، کوہ و بیاباں اک نشاں

میرے دریا کے مقابل آ، اگر صحرا ہے تو
لے مری بجلی کو دامن میں، اگر سینا ہے تو

چشمۂ آبِ بقا آیا جہاں میں میرے بات
مجھ کو خالق نے بنایا محرمِ رازِ حیات

ذرّہ بھی سوزِ نوا سے میرے زندہ ہو گیا
اور جگنوں کی طرح پر کھول کر اُڑنے لگا

راز گو مجھ سا جہاں میں اور ہو سکتا نہیں
اور کوئی یہ دُرِّ معنیٰ پرو سکتا نہیں

مجھ سے آ کر پوچھ لے اسرارِ عیشِ جاوداں
دیکھ لے افکار میں میرے زمین و آسماں

پیرِ گردوں نے کہے ہیں مجھ سے اسرارِ حیات
کس طرح اپنے ندیموں سے چھپاؤں کوئی بات؟

ساقیا بھر دے خدا کے واسطے یہ جام بھی!
کامراں ہو جائے تیرے فیض سے ناکام بھی!

اصل زمزم جس کی ہے، وہ آتشیں پانی پلا
وہ کہ ہے اس کا گدا جمشید اپنے وقت کا

آدمی کی فکر کو کرتا ہے جو ہشیار اور
دیدۂ بیدار کو کرتا ہے جو بیدار اور

بخشدیتا ہے وقارِ کوہ، جو اک کاہ کو
شیر کی قوت عطا کرتا ہے جو روباہ کو

خاک تیرہ کو بناتا ہے ثریا آستاں
قطرۂ ناچیز کو کرتا ہے بحرِ بے کراں

خامشی کو شورشِ محشر بنا دیتا ہے جو
مُرغ خونِ باز سے کرتا ہے پائے کبک کو

ساقیا بھر دے مرا ساغر شراب ناب سے
دور کر تاریکیٔ افکار کو مہتاب سے

تا شناسائے رہِ منزل دلِ آوارہ ہو
آشنائے ذوقِ بے تابی مرا نظارہ ہو

جستجوئے تازہ سے ہو جاؤں میں تا گرم رو
اور رہوں لذت شناس آرزوئے نو بہ نو

نور بن جاؤں غرض میں اہلِ دل کی آنکھ کا
اور جہاں کے کان میں ہو جاؤں گُم مثلِ صدا

قیمتِ جنسِ سخن کو تا دو بالا کر سکوں
چاہتا ہوں اس میں شامل آنسوؤں کو بھی کروں

کھول دوں دُنیا پہ پھر فیضانِ پیرِ روم سے
سینکڑوں دریائے بستہ مخزنِ اسرار کے

جانِ رومی عشق کے شعلوں سے ہے سرمایہ دار
میں جہاں میں ایک دم کی روشنی مثلِ شرار

شمع نے مارا ہے اک شبخوں مرے پروانے پر
اور شراب ناب نے حملہ کیا پیمانے پر

خاک کو میری کیا اکسیر پیر روم نے
کر دیئے جلوے ہویدا اس غبار تیرہ سے

ایک ذرّہ خاک صحرا کا سوئے گردوں چلا
تا کہ دامن تھام لے جا کر شعاع مہر کا

موج ہوں میں، اسکے دریا میں اگر منزل کروں
ہے یقین کوئی گرانمایہ گہر حاصل کروں

میں، کہ ہے اس کی شراب ناب سے مستی مری
اس کے انفاس مبارک سے ہے میری زندگی

شب مرا اندوہگیں دل مائل فریاد تھا
شورش یا رب سے ہنگام سکوت آباد تھا

مبتلائے شکوۂ بے مہری دوراں تھا میں
اور تھی پیمانہ اپنا دیکھ کر نالاں تھا میں

طائر نظارہ اس پرواز میں اتنا تھکا
بال و پر ٹوٹے، گرا، گرتے ہی محو خواب تھا

خواب میں آیا مرے پیر حقیقت آشنا
وہ، زبان پہلوی میں جس نے قرآں لکھ دیا

اور کہا مجھ سے کہ اے دیوانۂ ارباب عشق
بڑھ کے لے تو بھی تو اک جام شراب ناب عشق

اور اپنے دل میں کر ہنگامۂ محشر بپا
توڑ دے شیشہ کو سر پر آنکھ میں نشتر لگا

چھوڑ دے یہ قہقہے اور نالہ ہائے زار کر
خون کے آنسو بہا اور ٹکڑے ٹکڑے کر جگر

غنچہ ساں کب تک رہیگا باغ دوراں میں خموش
چاہیے ہونا تجھے گل کی طرح نکہت فروش

ہیں ترے دل میں بھی ہنگامے بہت مثل سپند
آگ پر رکھ محملِ دل کو ذرا اے ارجمند!

اپنی رگ رگ سے تجھے اے بے نوا! مثلِ جرس
چاہیے خوابیدہ نالوں کو جگانا ہر نفس

آگ ہے تو، بزمِ عالم تجھ سے روشن کیوں نہ ہو؟
اپنے شعلوں سے جلا افسردگانِ خام کو

کھول دے محفل پہ تو پیرِ مغاں کے راز کو
کسوتِ مینا پہن، موجِ شرابِ ناب ہو

مار دے پتھر پہ تو آئینہ افسوس کو
توڑ دے چوراہے پر اس شیشۂ ناموس کو

نیستاں کا بانسری کی طرح پھر پیغام دے
قیس کو آگاہ کر دے قومِ حے کے راز سے

اپنے نالوں کے لئے اندازِ نوایجاد کر
بزم کو پھر ہائے وہوئے تازہ سے آباد کر

قم کا اک نعرہ لگا، زندوں کو جانِ تازہ دے
تا ہوں احساسات پیدا ان میں اپنی زیست کے

اُٹھ کے ہو پھر جادۂ آئینِ نو پر گام زن
سر سے اپنے دور کر دے جوشِ سودائے کہن

آشنائے لذتِ گفتار ہونا چاہیئے
اے درائے کارواں! بیدار ہونا چاہیئے

لگ گئی میرے بدن میں آگ اس تقریر سے
اور ہوا ہنگامہ آرا نالۂ شبگیر سے

اپنے بستر سے اٹھا یوں، تار سے جیسے صدا
اور کانوں کے لئے فردوس کا ساماں کیا

آشکارا کر دیا میں نے خودی کے راز کو
بے حجابانہ دکھایا اک چھپے اعجاز کو

تھی جہاں میں میری ہستی ایک نقشِ ناتمام
ناقبول و ناکس و ناکارہ گویا محض نام

عشق کی صیقل گری نے مجھ کو آدم کر دیا
عالمِ اسماءِ چون و چند عالم کر دیا

میں نے دیکھا ہے فلک کی حرکتِ اعصاب کو
اور رگوں میں چاند کی دورانِ خونِ ناب کو

واسطے انساں کے روئی ہیں یہ آنکھیں کتنی رات!
تب کیا ہے چاک میں نے پردۂ رازِ حیات

رکھتی تھی سینے میں جس کو کارگاہِ ممکنات
میں نے افشا کر دیا وہ رازِ تقویمِ حیات

میں، کہ جس نے اس اندھیرے میں اجالا کر دیا
کچھ نہیں اک خاک پا ہوں ملتِ اسلام کا

شہرہ جس ملت کا باہر حیطۂ اندازہ سے
دل میں شعلے مشتعل جس کے سرودِ تازہ سے

ذرہ ہو کر مہر رخشاں جس نے حاصل میں لئے
بھر لئے خرمن ہزاروں رومی و عطار کے

ہوں سراپا آہ، منزل ہے مری چرخ بریں
گو کہ ظاہر میں دھواں ہوں خلقتہً ہوں آتشیں

میرے خامے نے مری فکرِ رسا کے زور سے
کھول کر افلاک کے اسرارِ پنہاں رکھ دیئے

تا کہ قطرہ جان لے ہم پایۂ دریا ہوں میں
ذرّہ بھی سمجھے، حریفِ وسعتِ صحرا ہوں میں

اس سخن گوئی سے میرا شاعری منشا نہیں
بت پرستی، بتگری، ہرگز مرا شیوا نہیں

فارسی نا آشنا ہوں، اصل ہے ہندی مری
ہے مرا پیمانہ خالی ماہِ نو ہوں میں ابھی

حسنِ اندازِ بیاں کی مجھ سے مت امید رکھ
خوانسار و اصفہاں کی مجھ سے مت امید رکھ

گرچہ شیریں ہے بہت ہندی بھی بے چون و چرا
ہے مگر طرزِ زبانِ فارسی شیریں سوا

ہو گیا مسحور اس کے حسن سے فکرِ رسا
بن گیا ہے شاخِ نخلِ طور یہ خامہ مرا

مجھ کو خالق نے دیا ذہن رسا، فکر بلند
اس لئے مجھ کو زبان فارسی آئی پسند

نکتہ چیں! امیری شراب ناب سے ہو بہرہ ور
عیب اگر مینا میں ہو کوئی تو کچھ پروا نہ کر

اس بیان میں کہ نظام عالم کی اصل خودی سے ہے اور تعیّنات وجود کی زندگی کا تسلسل استحکامِ خودی پر موقوف ہے۔

ہم جہاں کہتے ہیں جس کو، ہیں یہ آثارِ خودی
دیکھتی ہے آنکھ جو کچھ، ہیں یہ اسرارِ خودی

سو رہی تھی جب خودی غیرِ خدا کچھ بھی نہ تھا
جاگتے ہی عالم پندار پیدا ہو گیا

ایسے عالم سینکڑوں پوشیدہ اس کی ذات میں
ہے وجودِ غیر اس کی ذات کے اثبات میں

آپ ہی کو غیر سمجھا، یہ غضب کیسا کیا!
دشمنی کا بیج آ کر اس جہاں میں بو دیا

غیر کے پیکر بناتی ہے وہ اپنے ہاتھ سے
تا مزے حاصل ہوں اس کو لذتِ پیکار کے

مارتی رہتی ہے ان کو قوتِ بازو سے وہ
اور خوش ہوتی ہے اپنا امتحاں لے کے وہ

خود فریبی ہے خودی کے واسطے عینِ حیات
جس طرح خوں سے وضوئے گل کے لئے عینِ حیات

سینکڑوں باغوں کا خوں کرتی ہے اک گل کے لئے
سینکڑوں شیون نوائے شوقِ بلبل کے لئے

اک فلک کے واسطے پیدا کئے صدہا ہلال!
سینکڑوں اُس نے گڑھے اک حرف کی خاطر مقال

اور جو پوچھو کیوں ہے، یہ اسراف اور بیں دلی
کہتی ہے، از بہر تکمیل جمال معنوی

حسنِ شیریں کو بنایا عذرِ دردِ کوہکن ۔۔۔ اور نافے کو بنایا عذرِ آہوئے ختن

سوزِ پیہم کو جو پروانوں کی قسمت میں لکھا ۔۔۔ شمع کو عذر ان کی جانبازی و محنت کا کیا

سینکڑوں امروز کے نقشے بنا کر رکھ دیئے ۔۔۔ تا کہ اک دن صبحِ فردائے قیامت دیکھ لے

لاکھوں ابراہیم کو دکھلا دیئے شعلوں کے باغ ۔۔۔ تب کہیں روشن کیا ہے اک محمدؐ کا چراغ

اس جہانِ آب و گل میں بہرِ اغراضِ عمل ۔۔۔ ہے کبھی عامل، کبھی معمول و اسباب و علل

بھاگتی اور دوڑتی، اٹھتی اٹھاتی ہے وہی ۔۔۔ مارتی مرتی، اُگاتی اور جلاتی ہے وہی

اس کی جولانگاہ ہے یہ وسعتِ لیل و نہار ۔۔۔ اس کی گردِ راہ سے یہ آسماں موجِ غبار

باغِ عالم میں یہ رونق اس کی گلکاری سے ہے ۔۔۔ رات اس کے خواب سے، دن اس کی بیداری سے ہے

اپنے شعلے سے شرر کو اس نے اک حصہ دیا ۔۔۔ اور خرد کو جزو کا وارفتہ و شیدا کیا

اپنے ٹکڑے کر دیئے، اجزا کو پیدا کر دیا ۔۔۔ خود پریشاں ہو گئی صحرا کو پیدا کر دیا

اور پریشانی سے جس دم ہو گئی بیزار وہ ۔۔۔ جمع کر کے اپنے اجزا بن گئی کہسار وہ

خودنما ہونا خودی کی ایک عادت ہے قدیم ۔۔۔ اس کی قوت ہے نہاں ہر شے میں اے مردِ سلیم!

قوتِ خاموش ہے لیکن ہے بیتاب عمل
اور عمل کے ساتھ ہے پابندِ اسباب عمل

ہے جہاں کی زندگی وابستۂ زورِ خودی
جتنی محکم ہے خودی اتنی ہی محکم زندگی

قطرے نے حرفِ خودی جس وقت ازبر کر لیا
اپنی ہستیٔ تنک مایہ کو گوہر کر لیا

بادہ بے پیکر ہے، جب اپنی خودی میں خام ہے
اپنے پیکر کے لئے منت پذیرِ جام ہے

اور پیکر اپنا رکھتا ہے اگرچہ جام مے
یہ ہمارا اپنی گردش کے لئے محتاج ہے

کوہ نے اپنی خودی کھوئی تو صحرا ہو گیا
شکوہ سنج جوششِ طوفانِ دریا ہو گیا

موج جب تک موج رہتی ہے تہ آغوشِ بحر
رہتی ہے زورِ خودی سے وہ سوارِ دوشِ بحر

دید کی خواہش سے جب تک آنکھ میں جنبش رہی
اس سے ہوتی ہی رہیں پیدا شعاعیں نور کی

سبزے نے اُگنے کی قوت پائی اپنی ذات سے
پھاڑ ڈالا سینۂ گلشن کو اپنے ہات سے

شمع نے پہنائی خود زنجیر اپنے آپ کو
کر لیا ذروں سے جب تعمیر اپنے آپ کو

آپ کو کھویا بنا کر خود گدازی کا شعار
اپنی آنکھوں سے گری وہ مثلِ اشکِ سوگوار

سخت فطرت میں اگر کچھ اور ہو جاتا نگیں
زخم پھر اس طرح اپنے دل پہ وہ کھاتا نہیں

جب کہ ہو جاتا ہے نام غیر سے سرمایہ دار
بوجھ ہے اس نام کے کرتا ہے سینے کو فگار

جب زمیں اپنی خودی میں ہو گئی ثابت قدم
چاند اس کے گرد کرتا ہے طوافِ دم بہ دم

اور زمیں سے بھی سوا محکم ہے ہستی مہر کی
پس زمیں محتاج ہے اس کی نگاہِ مہر کی

ہوتی ہیں حیران آنکھیں دیکھ کر شانِ جبار
جس کی سطوت سے ہے کوہستان بھی سرمایہ دار

آگ کے شعلوں سے اسکے پیرہن کا ہے طراز
اصل ہے اسکی فقط اک دانۂ گردن فراز

قوتوں سے ہوتی ہے جب دم خودی سرمایہ دار
کرتی ہے ندی سے پیدا بحرِ ناپید اکنار

اس بیان میں کہ حیات خودی تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے۔

مدعا ہی سے ہماری زندگی کی ہے بقا
مدعا ہی کاروانِ زندگی کا ہے درا

ہے فقط پیہم تلاش و جستجو میں زندگی
ہے فقط مضمر مسلسل آرزو میں زندگی

آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ اے مردکار
ورنہ بن جائیگی مشتِ خاک تیری اک مزار

آرزو ہے بے خبر! جانِ جہانِ رنگ و بو
ہے یہاں ہر چیز کی فطرت امینِ آرزو

رقصِ دل سینوں میں ہے ہر دم اسی کے زور سے
اس کی تابانی سے بن جاتے ہیں سینے آئینے

اس سے اڑنے کے لئے تیار مشتِ خاک بھی
خضرِ رہ بن جاتی ہے یہ موسیٰ ادراک کی

دل کی ہے لے دیکھے سوزِ آرزو سے زندگی
غیر حق کی موت ہے جب دل میں یہ پیدا ہوئی

آرزوئے نو بہ نو سے دل اگر خالی ہوا
شہپرِ پرواز ٹوٹے اور زمیں پر آرہا

آرزو پر ہے تگ و تازِ خودی کا انحصار
آرزو بحرِ خودی کی ایک موج بے قرار

آرزو صید مقاصد کے لئے ہے اک کمند
آرزو ہے دفترِ افعال کی شیرازہ بند

آدمی بے آرزو کے فی الحقیقت مردہ ہے
جس طرح گرمی نہ ہو تو شعلہ بھی افسردہ ہے

دیدۂ بیدار کیا ہے اصل میں اے ہوشیار!
لذتِ دیدار نے کر لی ہے صورت اختیار

کبک کو پاؤں دیئے ہیں شوخیِ رفتار نے
دی ہے یہ منقار بلبل کو نوائے زار نے

ہو گئی جب بانسری اپنے نیستاں سے جدا
ہو گیا زنداں سے اس کا نغمہ بھی آخر رہا

عقل جو گیتی نورد و آسماں پرواز ہے
تو سمجھتا بھی ہے کچھ ناداں! یہ کیا راز ہے؟

آرزو سے زندگی ہوتی ہے جب سرمایہ دار
آرزو سے ہوتی ہے پیدا یہ عقل طرفہ کار

کیا ہے نظم قوم اور کیا ہیں یہ آئین و رسوم؟
اور ہیں کیا چیز یہ انواع و اقسام علوم؟

آرزو حد سے بڑھی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی
پھر ہر اک ٹکڑے نے پیدا کر لی اک صورت نئی

دست و دنداں کیا ہیں اور چشم و دماغ و گوش کیا؟
اور یہ فکر و تخیّل اور شعور و ہوش کیا!

زندگی نے جنگ کے میداں میں جب رکھا قدم
کر لیے آلات یہ اپنے تحفظ کے بہم

آگہی ہرگز نہیں ہے علم و فن سے مدعا
غنچہ و گلبن نہیں جیسے چمن سے مدعا

علم و فن ساماں ہیں حفظ زندگی کے واسطے
ہیں یہی اسباب تقویم خودی کے واسطے

زندگی کے علم و فن ادنیٰ سے ہیں خدمت گذار
زندگی کے علم و فن ہیں خانہ زادے کامگار!

زندگی کے راز سے غافل ذرا ہوشیار رہو!
اور کیفِ بادۂ مقصود سے سرشار ہو!

ایسا مقصد، صبح کے مانند جو تابندہ ہو
ماسویٰ کے حق میں جو اک آتشِ سوزندہ ہو

ایسا مقصد، آسمانوں سے کہیں بالا ہو جو
دلستانی، دلربائی میں بہت یکتا ہو جو

برق بن کر خرمن دنیائے باطل پھونک دے
اور عالم میں بپا اک فتنۂ محشر کرے

رکھتی ہے تخلیقِ مقصد زندگی سے کامیاب
آرزو کے دم سے قائم ہے ہماری آب و تاب

اس بیان میں کہ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

نور کا وہ ایک نقطہ نام ہے جس کا خودی
جو ہمارے تن میں ہے مثلِ شرارِ زندگی

وہ محبت کے سبب سے اور بھی ہے استوار
ہے اسی سے وہ درخشاں اور اسی سے پائدار

اس کے جوہر میں چمک ہوتی ہے پیدا عشق سے
ارتقا ہوتا ہے اس کی قوتوں کا عشق سے

اس کی فطرت عشق سے ہوتی ہے جب آتش بجاں
روشنی سے اس کی ہوتا ہے منور اک جہاں

عشق کو تلوار کا ڈر ہے، نہ کچھ خنجر سے باک
عشق کی طینت میں کب داخل ہیں آب و باد و خاک

عشق صلح و آشتی ہے عشق ہی پیکار ہے
عشق ہی آبِ بقا ہے، تیغ جوہر دار ہے

عشق کی ادنیٰ نظر سے سنگِ خارا پاش پاش
عشق حق میں طاقتِ حق ہے، یہ سمجھے کوئی کاش!

لے کسی معشوق کی الفت کا سودا اپنے سر
اور پیدا قلبِ ایوبؑ و نگاہِ نوحؑ کر

رکھ کسی کامل کے سنگِ آستاں پر اپنا سر
ہے بنانا اپنی مشتِ خاک کو اکسیر اگر

مثل مولانائے رومی اپنی شمع کو جلا
پھونک دے تبریز کی بجلی سے خرمن روم کا

ہے ترے دل میں ہی اک معشوق پنہاں بے خبر!
آ، دکھاؤں تجھ کو میں تو آنکھ رکھتا ہے اگر

اس کے عاشق، خوبرویانِ جہاں سے خوب ہیں
کتنے زیبا، کیسے خوش رو، کس قدر محبوب ہیں!

عشق سے اس کے ثریا پر پہنچ جاتی ہے خاک
عشق سے اس کے توانا عاشقانِ سینہ چاک

عشق کی کیفیتوں سے آگیا جب اس کو وجد
اٹھ کے جا پہونچی زمیں سے آسماں پر خاکِ نجد

ہے دل و جاں میں مسلماں کے مقامِ مصطفیٰ
آبرو مسلم کی ہے دنیا میں نامِ مصطفیٰ

طور کیا ہے؟ اسکے کاشانے کی اک موجِ غبار
اور اس کا گھر ہے کعبے کا حرم اے ہوشیار!

ہے ابد اک آن اوقاتِ شہِ لولاک سے
طالبِ افزائش کی ہے وہ اس کی ذاتِ پاک سے

ٹاٹ کا ٹکڑا ہے اسکے خوابِ راحت سے نہال
اور غلاموں نے کئے ہیں تاجِ کسریٰ پائمال

وہ شبستانِ حرا میں جب ہوا خلوت نشیں
ہو گئے پیدا حکومت، قوم اور آئین و دین

کتنی راتوں اس کی آنکھیں ایک دم سوئی نہیں
کر دیا امت کو لیکن مالکِ تاج و نگیں

وقتِ جنگ آیا تو اسکی تیغ ہے آہن گداز
اشکبار آنکھیں ہیں جب دم ہو گیا محوِ نماز

معرکوں میں، قاطعِ نسلِ سلاطیں اسکی تیغ
اور ہنگامِ دعائے فتح، آہیں، اس کی تیغ

اس نے دنیا کے لئے آئین نو پیدا کیا
مسندِ اقوامِ ماضی کو الٹ کر رکھ دیا

دین کی کنجی سے کھولا دولتِ دنیا کا در
لائے گی ثانی کہاں سے اس کا یہ نوعِ بشر

توڑ ڈالا اس نے ادنیٰ اور اعلیٰ کا نظام
اپنے دسترخوان پر بٹھلا لیا اپنا غلام

جنگ میں جب وقت اس شاہِ امم کے سامنے
قید میں اس طرح آئی دخترِ سردارِ طے

تن برہنہ پاؤں تھے زنجیر میں جکڑے ہوئے
اپنی گردن کو جھکا رکھا تھا مارے شرم کے

جوں ہی اس عالم میں حضرت کی نظر اس پر پڑی
اپنی چادر روئے دختر پہ اٹھا کر ڈال دی

آج اس سے بھی زیادہ آہ بے پردا ہیں ہم
روبروِ اقوامِ عالم کے بہت رسوا ہیں ہم

اعتبار اپنا ہے محشر میں وہ شاہِ دوجہاں
اور دنیا میں ہماری آبرو کا پاسباں

اس کا لطف و قہر اک رحمت ہے، دنیا کے لئے
دوستوں کے حق میں یہ، وہ دشمنوں کے واسطے

دشمنوں پر جس نے بارانِ کرم برسا دیا
جس سے لاتثریب کا پیغام مکے نے سنا

ہم، کہ دنیا میں وطن کی قید سے آزاد ہیں
ایک ہیں، گو ہر طرف، ہر ملک میں آباد ہیں

گو حجازی اور چینی اور ایرانی ہیں ہم
ہر جگہ شبنم مگر اک صبحِ خنداں کی ہیں ہم

سب کے سب بدمستِ چشمِ ساقیٔ بطحا ہیں ہم
اور جہاں میں متحد مثلِ مے و مینا ہیں ہم

امتیازاتِ نسب اس نے مٹا ڈالے تمام
اس خس و خاشاک کا چھوڑا نہیں دنیا میں نام

اس نظامِ قوم کی وہ جان ہے، گو ایک ہے
جیسے ہر پتی ہزارے کی الگ، بو ایک ہے

اس کے دل کا رازِ سربستہ ہماری قوم تھی
نعرہ بے باکانہ مارا اس نے، یہ ظاہر ہوئی

میری خاموشی میں شورِ عشق اس کا آشکار
اسکی الفت کے ہزاروں نغمے مجھ سے ہم کنار

میں بھلا اس کی محبت کا بیاں کیونکر کروں!
روئی ہے فرقت میں اسکی خشک لکڑی اشکِ خوں

ہستیٔ مسلم اسی کی اک تجلّی گاہ ہے
طور پیدا جس سے ہوں وہ اسکی گردِ راہ ہے

اس کے آئینے کا ہے اک عکس یہ پیکر مرا
ہے وجود اس نیّرِ اعظم سے میری صبح کا

دم بدم بیتابیٔ دل سے مجھے آرام ہے
صبحِ محشر سے زیادہ گرم میری شام ہے

وہ مرا ابرِ بہاری ہے میں اس کا باغ ہوں
اسکی بارش سے مرے انگور کی رگ رگ میں خوں

کشتِ الفت میں جب ان آنکھوں کو میں نے بو دیا
کیا کہوں کیسا تماشا مجھ کو حاصل میں ملا!

خاکِ یثرب کے مقابل ہیچ ہیں دونوں جہاں
کتنا اچھا شہر ہے وہ اپنا دلبر ہے جہاں!

مار ڈالا مجھ کو طرزِ مولوی جامؔ نے
اس کی نظم و نثر میں پایا علاج اس خام نے

ہیں ہزاروں معنی دلکش لباسِ سادہ میں
شعر کیا موتی پروے ہیں ثنائے خواجہ میں

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست[1] (جامیؔ)

حاملِ صد کیفیت صہبائے جامِ عشق ہے
اور یہ تقلید کیا ہے؟ ایک نامِ عشق ہے

کاملِ بسطام جو تقلید میں تھا لاجواب
کر لیا خربوزہ کھانے سے بھی اس نے اجتناب

تو بھی عاشق ہے تو پھر ایسی ہی کر تقلید یار
تیرا جامِ عشق بھی ہو جائے گا یزداں شکار

اک ذرا اپنے حرائے دل میں کر لے اعتکاف
جانبِ حق چل خودی کو چھوڑ کر لاف و گزاف

حق سے محکم ہو کے پھر خود کی طرف ہو گام زن
اور بن جالات و عزّائے ہوس کا بت شکن
عشق کی قوت سے پہلے ایک لشکر جمع کر
شوق سے پھر عشق کے فاراں پہ ہو جلوہ گر

تا کہ نازل تجھ پہ ہوں الطاف و افضالِ خدا
اور بنے تو مظہر اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْض کا

[1] ترجمہ۔ مصطفیٰؐ اس نسخۂ کونین کا دیباچہ ہے ۔ سارا عالم ہے غلام اس کا وہ سب کا خواجہ ہے

اس بیان میں کہ خودی سوال سے ضعیف ہو جاتی ہے۔

اے کبھی حاصل کیا تھا جس نے شیروں سے خراج!
آج ناداری کے باعث ہو گیا روبہ مزاج

یہ مصیبت پر مصیبت تجھ پہ ناداری سے ہے
درد دکھ تیرا تہی دستی کی بیماری سے ہے

چھین لیتی ہے یہ تجھ سے رفعتِ فکرِ رسا
اور کر دیتی ہے گُل تیرے تخیّل کا دیا

تو بھی میخانے سے ہستی کے مئے گلفام لے
حاصل ایام ہے، اس زندگی سے کام لے

اونٹ سے فاروقِ اعظمؓ کی طرح نیچے اُتر
غیر کے احسان سے پرہیز کر، پرہیز کر!!

مانگتا کب تک پھرے گا منصب و دولت کی بھیک
حیف ہے، یہ لے سواری مثلِ طفلانِ رکیک

فطرتِ عالی، جو ہو تو آسمانوں سے بلند
غیر کے احساں سے ہو جاتی ہے وہ خوار و نژند

ایک مفلس مانگنے سے خوار ہو جاتا ہے اور
اور گدائی سے، گدا نادار ہو جاتا ہے اور

بھیک سے آشفتہ ہو جاتے ہیں اجزائے خودی
بے تجلّی اس سے نخلِ طور سینائے خودی

اپنی ہستی کو نہ کر برباد اے فرخندہ فال!
چاند بن اور اپنی روٹی اپنے پہلو سے نکال

نکبت و افلاس کتنا ہی نہ تجھ کو گھیر لے
اور بدبختی تجھے سیلِ فنا میں ڈال دے

اپنی روزی نعمتِ اغیار سے حاصل نہ کر
چشمۂ خورشید سے پانی نہ مانگ اے بے خبر!

تا رسول اللہ کے آگے نہ ہو تو منفعل
حشر کے دن، جب بڑی مشکل میں ہونگے جانِ دل

چاند روزی پاتا ہے سورج کے دسترخوان سے
داغ رکھتا ہے وہ اپنے دل پر اس احسان سے

ہمت حق پر فلک سے بر سرِ پیکار رہو
تا نہ تجھ سے ملت بیضا ذلیل و خوار ہو

گرد سے جس نے بتوں کی پاک کعبے کو کیا
مرد کا سب کو لقب بخشا حبیب اللہ کا

حیف اس پر جسکی روزی دوسرے کے خوان سے
جس کی گردن ہو گئی خم غیر کے احسان سے

آپ کو جس نے جلایا برق لطفِ غیر سے
نقدِ غیرت کو گنوایا ایک روٹی کے لئے

اے خوشا وہ تشنہ جو ہے دھوپ میں بھی شاد کام
جو خضر سے بھی نہ مانگے پیاس میں پانی کا جام

مانگنے کی شرم سے ہوتا نہیں جو تر جبیں
آدمی ہوتے ہوئے جو مشتِ گل بنتا نہیں

اس جہاں آب و گل میں وہ جوانِ ارجمند
ناز سے چلتا ہے مانند صنوبر سر بلند

جو تہی دستی میں ہو جاتا ہے کچھ خود دار اور
بخت سوتا ہے تو وہ ہوتا ہے کچھ بیدار اور

بھیک کا قلزم نہیں کم آگ کے سیلاب سے
خود ملے شبنم تو بہتر گوہر نایاب سے

تو حباب آسا گرہ میں غیرت مردانہ رکھ
بحر میں رہتے ہوئے اپنا نگوں پیمانہ رکھ

اس بیان میں کہ خودی جب عشق و محبت سے مضبوط ہو جاتی ہے تو عالم کے قوائے ظاہر و مخفی کو مسخر کر لیتی ہے۔

جب محبت نے خودی سے زور حاصل کر لیا
عالم کون و مکاں پر ہو گئی فرماں روا

آسمانوں پر کواکب کے ہیں جو نقش و نگار
یہ خودی کی شاخ سے غنچے کھلے ہیں بے شمار

اس سے ہوتا ہے ظہور قوتِ بازوئے حق
چاند بھی اس کا اشارہ پا کے ہو جاتا ہے شق

وہ جہاں کے باہمی جھگڑوں کی بنتی ہے حَکَم
سر جھکا دیتے ہیں اس کے سامنے دارا و جم

آشناؤں تجھ کو شاہِ بو علیؔ کی داستاں
تھا سوادِ ہند میں نام اس کا روشن بے گماں

وہ، کہ تھا اک نغمہ میرا بلبلِ باغِ قدیم
وہ، گُلِ رعنا کی جس نے ہم کو پہنچائی شمیم

جنت ہندوستاں تھی اصل میں آتش نژاد
اس کے دامن کی ہوا سے ہو گئی مینو سواد

اک مرید اس کا روانہ جانبِ بازار تھا
اور شرابِ بو علی کے نشہ میں سرشار تھا

عاملِ شہر اس طرف آتا تھا گھوڑے پر سوار
سینکڑوں جس کی جلو میں تھے غلام و چوبدار

اس سے اک چاوش نے بڑھ کر کہا اے بے خبر!
بند یوں رستہ جلو داران عامل کا نہ کر

پر جھکائے سر یونہی چلتا رہا مردِ فقیر
غوطہ زن تھا اپنے بحرِ فکر میں وہ راہ گیر

جام استکبار سے تھا مست چاوش پلید
سر پر اسکے کھینچ کر اک چوب دستی کی رسید

وہ مرید آزردہ ہو کر اس جگہ سے چل دیا
پر بہت افسردہ خاطر، ناخوش و دلگیر تھا

جا کے اپنے پیر کی خدمت میں فریادی ہوا
اور اک سیلابِ اشک آنکھوں سے جاری کر دیا

جس طرح کہسار پر گرتی ہے برق بے پناہ
سیلِ آتش شیخ کی باتوں سے جاری ہو گیا

آتش دل نے کیا کچھ اور بھی اس کے سوا
حکم اس غصے میں اس نے اپنے منشی کو دیا

لے قلم، اور میں لکھاتا ہوں تجھے فرمان لکھ
اس فقیر بے نوا سے جانب سلطان لکھ

میرے خادم کو ترے عامل نے کیا مارا عصا
خرمن ہستی کو اپنے نذر آتش کر دیا

برطرف کر دے اُسے گر چاہتا ہے اپنا راج
سونپتا ہوں دوسرے کو ورنہ تیرا تخت و تاج"

مردِ حق آگاہ کا جس دم اسے فرمان ملا
جسمِ شہ پر دیکھتے ہی اس کے لرزہ پڑ گیا

اور چہرہ منظرِ آلام ہو کر رہ گیا
زرد مثلِ آفتابِ شام ہو کر رہ گیا

پہلے اک زنجیر عامل کے گلے میں ڈال دی
پھر قلندر سے معافی کے لئے تدبیر کی

خسروِ ہندوستاں، شیریں بیاں، رنگیں بیاں
جس کے نغمے آئینہ دارِ رموزِ کن فکاں

وہ، کہ فطرت اسکی روشن تھی مثال ماہتاب
شہ کی جانب سے ہوا بہرِ سفارت انتخاب

بارگاہِ بوعلی میں جب ہوا نغمہ سرا
شیشۂ جاں کو نوائے درد سے پگھلا دیا

شوکتِ درویش جو کہسار سے بھی پختہ تھی
قیمت یک نغمۂ گفتار ہو کر رہ گئی

مت روا رکھنا کبھی آزارِ مردانِ خدا
آتشِ سوزاں کا گر چکھنا نہ ہو تم کو مزا

اس معنی میں کہ نفی خودی کا مسئلہ اقوامِ مغلوبہ کی اختراعات سے ہے۔
جو اس پوشیدہ طریقہ سے اقوامِ غالبہ کے اخلاق کو ضعیف کرتی ہیں۔

کیا سنی تو نے کبھی وہ داستانِ دل نشیں؟
بھیڑیں کچھ اک مرغزارِ تازہ میں آباد تھیں

گھاس کی کثرت تھی اور افزائشِ اولاد تھی
اور وہ بھیڑوں کی دنیا فکر سے آزاد تھی

جب غریبوں کا مقدر ہو گیا ناسازگار — ہو گئیں تیرِ بلائے ناگہانی کا شکار

شیر اس جنگل کے آخر ان سے واقف ہو گئے — تاک میں ہر لحظہ شبخون کے لئے رہنے لگے

جذبِ استیلا ہے قوی کا ہمیشہ سے شعار — فتح مندی، کامرانی، اس کا رازِ آشکار

شیرِ نر نے آ کے اعلانِ شہنشاہی کیا — حریت سے بھیڑ کو محروم یکسر کر دیا

کام ہی دنیا میں شیروں کا ہے کیا غیر شکار! — خون سے ہونے لگا بھیڑوں کے رنگین مرغزار

گو سفند اک ان میں، جو چالاک و فہمیدہ تھی — کہنہ سالی کے سبب سے گرگِ باراں دیدہ تھی

تھی جو بدبختی سے اپنی قوم کی سینہ فگار — اور شیروں کے مظالم سے بہت زار و نزار

جب بہت کچھ گردشِ دوراں کے شکوے کر چکی — آخر اپنے کام کی تدبیرِ محکم اس نے کی

وقت پر اپنی حفاظت کے لئے ہر ناتواں — کام میں لاتا ہے عقلِ حیلہ گر کو بے گماں

بندگی میں بند ہو جاتا ہے جب ہر راستا — قوتِ تدبیر پھیلاتی ہے اپنے دست و پا

پختہ ہو جاتا ہے جب دل میں جنونِ انتقام — سوچنے لگتی ہے فتنے سینکڑوں عقلِ غلام

بھیڑ نے دل میں کہا، اب چارہ مشکل نہیں! — اب ہمارے قلزمِ غم کا کوئی ساحل نہیں!

بھیڑ کی طاقت کہاں، پائے جو شیرِ نر سے نجات
آہ وہ فولاد بازو اور نازک اپنے ہات

غیر ممکن ہے کہ وعظ و پند سے کوئی بشر
گوسفندوں کو سکھائے خوئے گرگِ کینہ ور

شیرِ نر کو بھیڑ کر دینا مگر آسان ہے
شیر کو چاہے بنانا بھیڑ، وہ نادان ہے

پہلے اپنے آپ کو شیروں کا پیغمبر کہا
پھر زراہِ پند ان سے اس طرح جا کر کہا

"اس قدر غافل ہے کیوں اے قوم ظالم کینہ و
بے خبر ہے تو عذابِ روزِ محشر سے مگر؟

غور سے سن مایہ دارِ دولتِ ایماں ہیں ہم
اور شیروں کے لئے پیغمبرِ یزداں ہیں ہم

دیدۂ بے نور کی آیا ہوں بن کر روشنی
میں تمہارا پیشوا یعنی خدا کا ہوں نبی

جلد ان ناپاک کاموں سے گزرنا چاہیے
اے زیاں اندیش! فکرِ نفع کرنا چاہیے

تن زور آور تو ہوتا ہے زیاں کار و شقی
زندگی اپنی بنانی ہے تو چھوڑ اپنی خودی

پاک روحوں کی ہے ناداں گھانس اور چارہ غذا
چھوڑ دے جو گوشت کھاتا ہے وہ مقبولِ خدا

تیزیٔ دنداں تجھے رسوا کرے گی ایک دن
دیدۂ بیدار کو اعمیٰ کرے گی ایک دن

ناتوانوں کا، ضعیفوں کا ہے جنت مستقر
باعثِ نقصاں ہے قوت، ہوش میں آ بے خبر!

ہے تلاشِ عظمت و دولت سراسر شور و شر
تنگدستی ہے امارت سے جہاں میں خوب تر

گھات میں دانے کی کب بیٹھی ہے بجلی بے شعور
دانہ ہو جائے اگر خرمن تو ہے اس کا قصور

ذرّہ بن، صحرا نہ بن گر عقل و دانش ہے تجھے
تا ضیائے مہرِ عالم تاب سے حصّہ ملے

ذبح کر کے گوسفندوں کو ہے کیوں نازاں بھلا!
ذبح کر خود کو کہ اے ناداں! یہ ہے رتبہ بڑا

زندگی کو تیری کرتا ہے بہت ناپائدار
تیرا یہ جور و ستم، یہ انتقام و اقتدار

سبزہ پامال دیکھا سبز ہوتے بار بار
گردِ خوابِ مرگ کو آنکھوں سے دھوتے بار بار

غافل اپنے آپ سے ہو جا، اگر فرزانہ ہے
اور اگر تو آپ سے غافل نہیں، دیوانہ ہے

چشم و گوش و لب کو اپنے بند کر اے ارجمند!
تا کہ ہو تیرا تخیل ہمسرِ چرخِ بلند

یہ علف زارِ جہاں کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں!!
یہ خیالی چیز ہے دھوکا نہ کھا اے بے یقیں!

سخت کوشی تھی گراں شیرانِ خوں آشام پہ
کر چکا تھا دل میں ذوقِ تن پرستی اپنا گھر

آ گئی فوراً انھیں یہ پندِ خواب آور پسند
کھا گئے وہ اپنی خامی سے فریبِ گوسفند

جبکہ جو کرتا تھا پہلے گوسفندوں کا شکار
کر لیا اب اس نے دینِ گوسپندی اختیار

سازگار آئی جو شیروں کو چراگاہ علف
ہو گیا بالآخر ان کا گوہر شیری خزف

گھانس سے وہ تیزی دنداں بھی رخصت ہو گئی
ہیبت چشم شرارہ افشاں بھی رخصت ہو گئی

آہ پہلو میں نہ کچھ دل کا اثر باقی رہا
آئینے سے جوہر آئینہ رخصت ہو گیا

دل سے وہ جوش جنون کوشش کامل گیا
وہ تقاضائے عمل ، خضر طریق دل گیا

اقتدار و عزم و استقلال رخصت ہو گیا
اعتبار و عزت و اقبال رخصت ہو گیا

پنجہ ہائے آہنی بے زور ہو کر رہ گئے
مر گئے دل ، تن سراسر گور ہو کر رہ گئے

زور تن جب گھٹ گیا تو خوف جاں پیدا ہوا
خوف جاں پیدا ہوا ، سرمایۂ ہمت گیا

ہو گئے صد ہا مرض پیدا ، جو ہمت ہار دی
بیدلی ، کوتاہ دستی اور کمینہ فطرتی

بھیڑ کے افسوں سے آخر سو گیا شیر ژیاں
اور تنزل پر ہوا تہذیب کا اس کو گماں

اس معنی میں کہ افلاطون یونانی، کہ تصوف اور اقوام اسلامیہ کے ادبیات نے اس کے افکار سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ مسلک گوسپندی پر

گام زن تھا اس لئے اس کے تخیّلات سے بچنا واجب ہے۔

راہبِ دیرینہ، وہ مشہور افلاطون حکیم
تھا جو سرتاجِ گروہِ گوسپندانِ قدیم

جس کا گھوڑا ظلمتِ معقول میں گم ہو گیا
اور کوہستانِ ہست و بود ہی کا ہو رہا

اس پر افسوں چل گیا تھا ایسا نامحسوس کا
اعتبار اپنے ہی اعضا کا نہیں باقی رہا

زندگی کا راز مرنے میں بتایا مستتر
شمع کے بجھنے میں آئے اس کو سو جلوے نظر

ہو چکا ہے وہ ہماری فکر پر فرماں روا
جام ہے اس کا بڑا خواب آور و دانش رُبا

درحقیقت ہے لباسِ آدمی میں گوسفند
حکم اس کا گردنِ صوفی میں ہے مثلِ کمند

ماورائے چرخ اپنی عقل کو پہونچا دیا
عالمِ اسباب کو ظالم نے افسانہ کہا

کام تھا اس کا فقط تحلیلِ اجزائے حیات
کاٹ ڈالی اس نے شاخِ سروِ رعنائے حیات

فکرِ افلاطون نے رکھا ہے زیاں کا سود نام
بود کو نابود بتلاتی ہے اس کی عقلِ خام

اس کی فطرت سو گئی جب دم تو دیکھا ایک خواب
اس کی چشمِ ہوش نے پیدا کیا ہے اک سراب

لذتِ سعی و عمل سے لبکہ وہ محروم تھا
اس لئے سو جان و دل سے عاشقِ معدوم تھا

تھا جہاں میں منکرِ ہنگامۂ موجود وہ
بن گیا تھا خالقِ اعیانِ نامشہود وہ

زندہ دل کے واسطے یہ عالمِ امکاں ہے خوب
مردہ دل کے حق میں جیسے عالمِ اعیاں ہے خوب

اس کے آہو نے گنوایا سوت میں لطفِ خرام
لذتِ رفتار اس کے ہنس پر بالکل حرام

اس کی شبنم میں نہ تھا کچھ طاقتِ رم کا نشان
اس کے طائر کا تھا سینہ دم سے خالی بے گماں

اس کا دانہ لذتِ روئیدگی سے بے خبر
اور تڑپنے کا نہیں پروانے میں اس کے اثر

پاس اس کے ترکِ دنیا کے سوا چارا نہ تھا
کیونکہ اس غوغائے عالم کا اُسے یارا نہ تھا

شعلۂ افسردہ کی الفت میں ہارا اپنا دل
اور افیون خوردہ دنیا سے لگایا اپنا دل

آشیاں کو چھوڑ کر ایسا سوئے گردوں اُڑا
رخ نہ پھر اپنے نشیمن کی طرف اس نے کیا

ہاں خیال اس کا خُمِ گردوں میں جا کر گُم ہوا
یہ نہیں معلوم تلچھٹ یا کہ خشتِ خُم ہوا

قوم اس کے نشے سے مسموم ہو کر رہ گئیں
لذتِ اعمال سے محروم ہو کر رہ گئیں

حقیقتِ شعر اور اصلاح ادبیاتِ اسلامیہ کے بیان میں۔

گرم رو انسان کو رکھتا ہے داغِ آرزو
خاک کو آتش بناتا ہے چراغِ آرزو

آرزو سے زندگی کا، مے سے ہے لبریز جام
آرزو سے زندگی ہے گرم خیز و تیز گام

زندگی تسخیر کا مضموں ہے اور کچھ بھی نہیں
آرزو تسخیر کا افسوں ہے، اور کچھ بھی نہیں

زندگی صیاد ہے اور اس کا ہے دام آرزو
حسن کو عاشق کی جانب سے ہے پیغام آرزو

دل میں آخر کس لئے ہوتی ہے پیدا دم بدم
آرزو یعنی نوائے زندگی کا زیر و بم

جو بھی ہے دنیا میں زیبا و جمیل و خوشنما
ہے بیابانِ طلب میں وہ ہمارا رہنما

نقش تیرے دل میں جس کا بیٹھتا ہے استوار
آرزو کرتا ہے تیرے دل میں پیدا بار بار

حسن ہے دنیا میں خلاقِ بہارِ آرزو
جلوہ زارِ حسن ہے پروردگارِ آرزو

سینۂ شاعر ہے دنیا میں تجلّی زارِ حسن
سینۂ شاعر سے پیدا ہوتے ہیں انوارِ حسن

خوب بن جاتا ہے شاعر کی نگہ سے خوب تر
اس کے افسوں سے ہے فطرت کی نوا محبوب تر

اس کے دم سے باغ میں سیکھی ہے بلبل نے نوا
اور اسی کے غازے سے رخسارِ گل روشن ہوا

یہ اسی کے سوز کی تاثیر پروانوں میں ہے
اور اسی کا رنگ یہ الفت کے افسانوں میں ہے

بحر و بر کی وسعتیں پوشیدہ اس کے دل میں ہیں / نشو جہانِ تازہ مضمر اس کے آب و گل میں ہیں

ذہن میں اس کے ہزاروں بے اُگے لالے بھی ہیں / ناشنیدہ سینکڑوں نغمے بھی ہیں، نالے بھی ہیں

ہم نشینِ ماہ و انجم اس کی تخئیلِ رسا / خوب کا خالق ہے، وہ اور زشت سے ناآشنا

خضر ہے ظلمات میں اس کی نہاں آبِ حیات / زندہ تر اشکوں سے اس کے گلستانِ کائنات

ہم جو بے حد سست رَو، ناپختہ کار، سادہ ہیں / راستے میں منزلِ مقصود کے اُفتادہ ہیں

اس کا بلبل اس گلستاں میں نوا پیرا ہوا / ادراک حیلہ ہمارے واسطے پیدا کیا

تاکہ دکھلائے ہمیں لے جا کے فردوس حیات / حلقہ بن جائے مکمل، بڑھ کے یہ قوسِ حیات

چلنے لگتے ہیں یہاں اس کی درا پر قافلے / رقص کرتے جاتے ہیں اس کی نوا پر قافلے

وہ ہمارے گلستاں کے واسطے موجِ صبا / وہ ہمارے لالہ و گل کو نسیمِ جاں فزا

اس کی ترغیبوں سے بنتی ہے خود افزا زندگی / احتسابِ خویشتن میں ناشکیبا زندگی

اپنے دسترخوان پر دیتا ہے عالم کو صلا
کرتا ہے ارزاں وہ اپنی آگ کو مثلِ ہوا

حیف ہے اس قوم پر جو موت سے ہو بہرہ ور / اور شاعر اس کا ذوقِ زندگی سے بے خبر

زشت رو کو آئینہ اس کا دکھائے خوشنما / شہد میں اس کے چھپا ہو زہرِ نشتر سے سوا

اس کا بوسہ چھین لے رخسارِ گل سے تازگی / لوٹ لے بلبل کے دل سے لذتِ پروانہ بھی

سست کر ڈالے ترے اعصاب کو اس کی افیم / مار کر رکھ دیں تجھے اس کے خیالاتِ سقیم

اس کے دم سے ذوق رعنائی سے ہے بے بہرہ سرو / اور دم سرد اس کا شاہین کو بناتا ہے تدرو

ایسی مچھلی، جو کہ ہے سینہ سے سر تک آدمی / اور بناتِ آشیاں کی طرح دریا میں چھپی

ناخدا کو راگ سے لے خود بنا دیتی ہے جو / اس کی کشتی کو تہِ دریا سُلا دیتی ہے جو

جس کے نغمے تیرے دل سے لوٹ لیتے ہیں ثبات / موت کو تو جس کے جادو سے سمجھتا ہے حیات

زیست کی خواہش جدا کرتا ہے تیری جان سے / لعل عنابی چرا لیتا ہے تیری کان سے

وہ دکھاتا ہے زیاں کی شکل میں ہر سود کو / اور بنا دیتا ہے وہ مذموم ہر محمود کو

فکر و اندیشہ کے دریا میں گرا دیتا ہے وہ / اور عمل سے تجھ کو بیگانہ بنا دیتا ہے وہ

وہ خراب و خستہ اس کے شعر سے ہم خستہ حال / اس کے دورِ جام سے یہ بزمِ عالم خستہ حال

اس کے نیساں میں کبھی بجلی نہیں دیکھے گا تو   باغ ہے اس کا حقیقت میں سرابِ رنگ و بو

حسن میں اس کے صداقت کا نہیں نام و نشاں   ہیں بہت لے آب موتی اس کے دریا میں نہاں

خواب کو سمجھا ہے بیداری سے ظالم خوشنما   اپنے دم سے آگ کو سینوں میں ٹھنڈا کر دیا

اس کے بلبل کا ترنم زہر سے قاتل سوا   اس کے پھولوں کے تلے سویا ہوا ہے اژدہا

ہیں ہلاکت آفریں اس کے خُم و مینا و جام
زہر سے کچھ کم نہیں اس کی مۓ آئینہ فام

اے کہ تو اس کی شرابِ ناب سے خستہ جگر   اے کہ اس کے مشرقِ مینا سے ہے تیری سحر

اس کے نغموں سے ترا دل جوش سے ٹھنڈا ہوا   کان کے رستے سے تو نے زہرِ قاتل پی لیا

اے کہ پستی کی طرف رہبر ترا انداز ہے   اور تہی مایہ نوا سے تیرا تارِ ساز ہے

اس قدر اپنی تن آسانی سے زار و ناتواں!   دہر میں ننگِ مسلمانی ہے اب تو بے گماں

باندھ سکتی ہے رگِ گل تجھ کو اے مردِ سلیم!   خستہ و مجروح کر سکتی ہے اک موجِ نسیم!

عشق ہے رسوا زمانے میں تری فریاد سے   زشت رو تصویر ہے اس کی ترے بہزاد سے

اس کا چہرہ زرد ہے ظالم ترے آزار سے
تیری سردی سے ہے وہ محروم سوزِ نار سے

خستہ جاں وہ ہوگیا ہے خستہ جانی سے تری
ناتواں وہ ہوگیا ہے ناتوانی سے تری

گریۂ طفلانہ پیمانے ہیں اس کے رہ گیا
کچھ نہیں افلاس کے گھر میں آہ و نالہ کے سوا

بھیک سے میخانے کی سرشار رہتا ہے مدام
روزنِ کاشانہ سے جلوے چرانا اس کا کام

غمزدہ ہے اور افسردہ ہے اور آزردہ ہے
اور دربانوں کی ٹھوکر سے بچارہ مردہ ہے

ہوگیا ہے وہ غموں سے سوکھ کر مانندِ نے
آسماں کے ظلم سے ہر وقت لب پر شکوہ ہے

مکر و کینہ آج اس کا جوہر آئینہ ہے
ناتوانی، لاغری اک ہمدم دیرینہ ہے

عشق ہے اور پست بخت و زیر دست و دوں نہاد!
عشق ہے اور نا سزا و نا امید و نامراد!

اس کے شیون نے کیا ہے تیرا نقدِ جاں خراب
اس کے نالوں نے اڑایا چشمِ ہمسایہ سے خواب

حیف ایسے عشق پر ہے جس کا شعلہ بجھ گیا
کعبے میں پیدا ہوا بت خانے میں جا کر مرا

اے کہ تو رکھتا ہے اپنی جیب میں نقدِ سخن
رکھ عیارِ زندگی پر اس کو لے مخدوم من

فکر روشن بین ہے دنیا میں عمل کی رہنما
جیسے بجلی کی چمک دیتی ہے بارش کا پتا

فکر صالح چاہئے، گر ہے تجھے شوق ادب
فکر صالح کے لئے پھر لوٹ آ سوئے عرب

عشقِ سلمائے عرب میں دل کو گر رہن نیاز
تا کہ شام گرد سے پیدا ہو پھر صبح حجاز

تو نے گل چینی چمن زارِ عجم کی خوب کی
خوب تو نے نو بہار ہند و ایراں دیکھ لی

گرمیٔ صحرا کا بھی تھوڑا سا حاصل کر مزا
بادۂ دیرینۂ خرما بھی تو چکھ لے ذرا

دیکھ تھوڑی دیر اس کی راحتِ آغوش گرم
اس کی گرم آندھی میں بھی لے چل ذرا یہ جسم نرم

مدتوں تو ریشم و سنجاب میں لوٹا کیا
آپ کو کر پاس کی سختی کا بھی خوگر بنا

تو نے سیر گلستاں میں قرن کھوئے ہیں بہت
اپنے عارض مثلِ گل شبنم سے دھوئے ہیں بہت

خود کو اب تو ریگِ سوزاں پر بھی چل کر آزما
کچھ دنوں اب چشمہ زمزم میں بھی غوطے لگا

مثلِ بلبل نالہ و شیون کرے گا کب تلک!
ان چمن زاروں میں تو آخر رہے گا کب تلک!

اے، ہما بھی تیرے یمنِ دام سے ہے ارجمند
آشیانہ تو بنا اپنا سرِ کوہِ بلند

آشیانہ برق کے پہلو میں ہونا چاہئے
شاہبازوں کے نشیمن سے بھی اونچا چاہئے

تا کہ تو ہو جائے مردِ کارزارِ زندگی
شعلہ زن ہو جسم و جاں میں تیرے نارِ زندگی

اس بیان میں کہ تربیت خودی کے تین مرحلے ہیں۔ اوّل کو اطاعت
وسرے کو ضبطِ نفس اور تیسرے کو نیابت الٰہی کہتے ہیں۔

مرحلہ اوّل اطاعت

نت و خدمت سے خوش رہتا ہے کیا بیچارہ اونٹ!
صبر و استقلال کی دنیا کا ہے ہرکارہ اونٹ

نور قدموں کا نہیں کچھ، راہ جب چلتا ہے وہ
کارواں کے واسطے، اک کشتیِ صحرا ہے وہ

نش پا ہے اس کا، ہر جنگل کی قسمت میں لکھا
کم خور و کم خواب، اور محنت سے اس کو واسطا

ست ہے وہ، خواہ زیر بارِ محمل کیوں نہ ہو
خوش چلا جاتا ہے وہ، کیسی ہی منزل کیوں نہ ہو

سرخوش و سرشار ہے کیفیتِ رفتار سے
اور سفر میں صابر و قانع سوا آسوار سے

نو بھی سرتابی یونہی اپنے فرائض سے نہ کر
تا کہ لطفِ عندہٗ حسن المآب آئے نظر

کی طاعت میں ذرا کوشش کر اے غفلت شعار!
جبر کر اپنے پہ تا حاصل ہو تجھ کو اختیار

طاعت معبود سے ناکس بھی ہو جاتا ہے کس
سرکشی سے آگ کو دیکھا ہے ہوتے ہم نے خس

کر تو سکتا ہے شکار، ماہ و پروین تو، مگر
پہلے اپنے آپ کو آئین کا پابند کر

گل کے زنداں خانہ میں رہ کر ہوا خوشبو بنی
اور ہو پابند ہو کر نافۂ آہو بنی

جانبِ منزل رواں ہے انجم سیماب پا
کس قدر پابند ہے چلنے میں وہ آئین کا

سبزہ، جو پیدا نمو کے دین و آئین پر ہوا
ترک یہ آئین کیا، پامال ہو کر رہ گیا

متصل چلنا ہے جب قانونِ لالہ بے گماں
کس قدر اس کی رگوں میں خوں رہتا ہے رواں

قطرے دریا بن گئے ہیں، وصل کے آئین سے
ذرے صحرا بن گئے ہیں، وصل کے آئین سے

جب کہ آئین سے ہر اک شے کا قوی دل ہو گیا
پھر تو اے نادان کیوں آئین سے غافل ہو گیا

تو بھی آزاد اے مسلماں! اپنے آئین سے نہ ہو
زینتِ گردن بنا لے پھر اسی زنجیر کو

شکوہ سنج سختیٔ آئین نہ ہو اے بے عمل
اور حدودِ مصطفیٰؐ سے اس طرح باہر نہ چل

مرحلہ دوم۔ ضبطِ نفس

نفس ہے کس درجہ خود پرور ترا مثلِ شتر!
خود سری خود پرستی سے ہے اس کا سینہ پُر

مرد بن کر ہاتھ میں لے اپنے تو اس کی مہار
تا کہ اس دنیا میں قائم ہو ترا عزّ و وقار

جو نہیں ہوتا ہے اپنے آپ پر فرماں روا
وہ ہوا کرتا ہے تابع دوسروں کے حکم کا

آب و گِل سے تیرے پیکر کی رکھی جس دن بنا
خوف و الفت کو تری تعمیر میں داخل کیا

خوفِ عقبیٰ، خوفِ دنیا، خوفِ ایماں، خوفِ جاں
خوف کیسے! خوفِ آلامِ زمیں و آسماں

حبِّ دولت، حبِّ جاہ و منصب و حبِّ وطن
حبِّ فرزند اور حبِّ اقربا و حبِّ زن

امتزاجِ آب و گِل تن پروری کی ہے دلیل
کُشتۂ منکر ہمیشہ اور فحشا کا قتیل

ہاتھ میں جب تک رہے تیرے عصائے لا الٰہ
ہر طلسمِ خوف کو باطل بنائے لا الٰہ

جس تنِ نازک میں حق کے زور سے جاں پڑ گئی
اس کا سر باطل کے آگے جھک نہیں سکتا کبھی

خوف کو سینے میں اس کے راستہ ملتا نہیں
یعنی اس کے دل میں غیر اللہ کا کھٹکا نہیں

خوش ہے وہ، اقلیم لا میں جو کوئی آباد ہے
کیا زن و فرزند ہر اک فکر سے آزاد ہے

ماسوا سے اس قدر کرتا ہے وہ قطع نظر
راہ میں حق کی گوارا اس کو ہے ذبحِ پسر

ہے اکیلا وہ ہجومِ فوج و لشکر پر گراں
جان بھی ارزاں ہے اس کو مثلِ بادِ بیکراں

لاالہ ہے اک صدف اور اس کا گوہر ہے نماز
اور دلِ مسلم کے حق میں حج اصغر ہے نماز

ہاتھ میں مسلم کے یہ شمشیرِ خوں آشام ہے
قتلِ فحشا۔ نہی و منکر بس اسی کا کام ہے

روزہ درماں ہے پیاس اور بھوک کے امراض کا
خیبرِ تن پروری کو توڑتا ہے برملا

فطرتِ مومن جِلا پاتی ہے حج کعبہ سے
بھول جاتا ہے وطن کو مومن اس کے واسطے

ایسی طاعت، جو کہ اک سرمایہ جمعیت کا ہے
جس سے قائم ربط باہم فرد اور ملت کا ہے

حبِّ دولت کو زکوٰۃِ مال کرتی ہے فنا
اور بناتی ہے مسلماں کو مساوات آشنا

اور حتی تنفقوا سے دل کو کرتی ہے قوی
زر کی افزائش ہے اس سے، الفتِ زر کی کمی

واسطے تیرے یہ سب کچھ وجہ استحکام ہے
پختہ ہے تو بھی، اگر محکم ترا اسلام ہے

یا قوی کے ورد سے رکھ اپنی طاقت برقرار
تاکہ تو اس اشترِ خاکی کا ہو جائے سوار

مرحلہ سوم۔ نیابتِ الٰہی

ہوگیا تو اپنے خاکی اونٹ پر جب دم سوار
تیرا سر تاجِ سلیمانی سے ہوگا تاج دار

تو جہاں آرا رہے گا جب تلک ہے یہ جہاں
ملکِ لا یبلیٰ کا سر پر تاج ہوگا بے گماں

اس جہاں میں نائبِ حق بن کے رہنا خوب ہے،
حکم راں ہونا عناصر پر بہت محبوب ہے،

حق کا نائب بالیقیں ہوتا ہے اس عالم کی جاں
ہے جہاں میں اس کی ہستی اسمِ اعظم کا نشاں

اس کو ہوتی ہے رموزِ جزو و کل پر آگہی
اور خدا کے حکم پر چلنا ہے اس کی زندگی

عرصۂ عالم میں جب کرتا ہے وہ خیمہ بپا
ختم کر دیتا ہے قصہ اس بساطِ کہنہ کا

وہ نمائش چاہتا ہے فطرتِ معمور کی
خود بنا لیتا ہے اپنے واسطے دنیا نئی

یہ جہاں کیا! سینکڑوں ایسے جہانِ جزو و کل
اس کی کشتِ فکر سے ہوتے ہیں پیدا مثلِ گُل

کام اس کا ہے کرے وہ پختہ ہر اک خام کو
اور بیت اللہ سے باہر کرے اصنام کو

تارِ دل مضراب سے اس کی ہمیشہ نغمہ زا
حق کی خاطر اس کا سونا، حق کی خاطر جاگنا

وہ بڑھاپے کو سکھا دیتا ہے آہنگ شباب
اور بھر دیتا ہے ہر اک چیز میں رنگ شباب

ذات ہے اس کی بشیر نوع انساں اور نذیر
اور سپاہی بھی، سپہ سالار بھی ہے اور امیر

مدعائے علم الاسمار اسی کی ذات ہے
سر سبحان الذی اسریٰ اسی کی ذات ہے

اس کا روشن ہاتھ یارِ عصا ہے قوی
قدرت کامل صفت ہے، ایک اس کے علم کی

ہاتھ میں لیتا ہے اس کی باگ جب وہ شہسوار
اور ہو جاتا ہے چابک یہ سمندر روزگار

اس کی ہیبت خشک کر دیتی ہے رود نیل کو
مصر سے لیکر نکل جاتا ہے اسرائیل کو

اس کی قُم سے گورِ تن میں زندہ ہو جاتی ہے جاں
جس طرح سرو و صنوبر درمیان گلستاں

ہے جہاں کے واسطے توجیہ محکم اس کی ذات
اور اس کے دبدبے سے سارے عالم کی نجات

اس کا سایہ ذرے کو کرتا ہے خورشید آشنا
اس کے سرمائے سے یہ ہستی عالم بے بہا

اپنے اعجاز عمل سے بخشتا ہے زندگی
اس کے انداز عمل کی شان ہے ہر دم نئی

اس کے نقش پا سے جلوے ہوتے ہیں پیدا ہزار
پھرتے ہیں سینا میں اس کے سو کلیم آوارہ دار

زندگی کی وہ بیان کرتا ہے تفسیریں نئی
اور خواب زیست کی کرتا ہے تعبیریں نئی

درحقیقت اس کی ہستی زندگی کا راز ہے
اور سازِ زندگی کی اک عجب آواز ہے

طبعِ موزوں بندِ فطرت خون ہو ہو جاتی ہے
تب کہیں اک بیت اسکی ذات کی بن آتی ہے

اپنی مُشتِ خاک جا پہونچی ہے اب گردوں کے پار
اس غبارِ تیرہ سے پیدا ہو شاید وہ سوار

اپنی اس خاکسترِ امروز میں اے باصفا!
شعلۂ فردائے عالم سوز ہے سویا ہوا

اپنے غنچے میں ہے پوشیدہ بہارِ گلستاں
آنکھ کو رکھتا ہے روشن صبحِ فردا کا سماں

شہسوارِ اشہبِ دوراں! خدارا جلد آ
اے فروغِ دیدۂ امکاں! جمال اپنا دکھا

آ، خدارا رونقِ ہنگامۂ ایجاد ہو
اور آنکھوں میں ہماری آکے تو آباد ہو

آ، کہ پھر یہ شورشِ اقوام ہو جائے خموش
اپنے نغموں کو بنادے آکے تو فردوسِ گوش

آ، کہ قانونِ اُخوّت پھر جہاں میں عام ہو
بادۂ الفت کا ہر اک دل چھلکتا جام ہو

پھر جہاں میں لا خدا کے واسطے ایّامِ صلح
جنگ کے شیدائیوں کو آکے دے پیغامِ صلح

کشت زارِ نوعِ انساں کے لئے حاصل ہے تو
کاروانِ زندگی کے واسطے منزل ہے تو

کچھ نہیں چھوڑا گلستاں میں خزاں نے برگ وبار
آ، ہمارے باغ میں لے باغِ عالم کی بہار

سینکڑوں سجدے جوانوں اور بوڑھوں بچوں کے
آہ ہماری شرمگیں پیشانیوں سے نذر لے

پہلے تیری ذات سے مل جائے ہم کو اعتبار
پھر جہاں کے سونے سے ہو جائیں گے ہم سازگار

اسماءِ علیِ مرتضیٰؓ کے اسرار کی شرح میں

مُسلم اوّل، ولیِ حق، شہِ مردان علیؓ
عشق والفت کے لئے سرمایۂ ایمان علیؓ

الفتِ صادق سے اس کے دودماں کی زندہ ہوں
اس محبت ہی سے میں مثلِ گہر تابندہ ہوں

نرگسِ حیراں ہوں میں وارفتۂ نظارہ ہوں
بوئے گل کی طرح اس کے باغ میں آوارہ ہوں

زمزم اُبلے میری مٹی سے تو ہے اس کا کرم
اور مرے انگور سے ٹپکے جو مے اس کا کرم

خاک ہوں، اسکی محبت سے مگر آئینہ ہوں
دیکھ لو آواز سینے میں، وہ روشن سینہ ہوں

دیکھ کر اس کی طرف حضرتؐ نے یہ فرما دیا
ملّتِ بیضا کا اس سے دبدبہ بالا ہوا

اور فرمایا کہ ہے یہ قوتِ دینِ مبین
آل سے اس کی سنوریں گے دُنیا اور دیں

مرسلِ حق نے لقب اس کو دیا ہے "بوتراب"
حق نے فرمایا "ید اللہ" اس پہ شاہد ہے کتاب

جانتا ہے جو کوئی دنیا میں رازِ زندگی
جان سکتا ہے وہی اسرارِ اسماءِ علیؓ

وہ سیہ، تاریک مٹی نام ہے جس کا بدن
عقل جس کے ظلم سے ہے مبتلائے صد محن

فکرِ عالی کو زمیں پیما بنا دیتی ہے جو
آدمی کو بہرا اور اندھا بنا دیتی ہے جو

ہاتھ میں جس کے ہوس رانی کی شمشیرِ دوسر
سالکانِ راہِ حق جس سے زبوں خستہ جگر

اپنا تابع اس کو جب شیرِ خدا نے کر لیا
کر دیا اس خاک کو روشن مثالِ آئینا

مرتضیٰ، تلوار سے جس کی ہوا حق کامیاب
ہو گیا اقلیم تن کو فتح کر کے "بوتراب"

وہ جہاں میں مرد کشور گیر کرّاری سے ہے
اس قدر اس کے گھر کی آب خودداری سے ہے

اس طرح دنیا میں ہو جائے جو کوئی بوتراب
پھیر کر لے آئے مغرب کی طرف سے آفتاب

اسپ تن پر جس نے باندھا ہے یہاں مضبوط زین
خاتَم دولت پہ بیٹھا ہے وہی مثلِ نگیں

ہے شکوہِ خیبر اس عالم میں پیروں کے تلے
اُس جہاں میں ہاتھ اس کا قاسم کوثر بنے

وہ خود آگاہی کی دولت سے یداللّٰہی کرے
اور یداللّٰہی کی قوت سے شہنشاہی کرے

اس کی ذات پاک ہے "دروازہ شہر علوم" — زیر فرماں اسکے ہیں چین و حجاز و شام و روم

تابع فرماں بنالے تو بھی اپنی خاک کو — تا ترے انگور سے پیدا شراب ناب ہو

خاک ہو جانا تو ناداں! مذہب پروانہ ہے — باپ بن اس خاک کا، یہ شیوۂ مردانہ ہے

سخت ہو پتھر سا اے گل کی طرح نازک بدن — تاکہ قائم تجھ سے ہو بنیادِ دیوارِ چمن

خاک سے تیری بنے انسان، وہ تدبیر کر — اور انساں کے لئے تازہ جہاں تعمیر کر

گر بنائے گا نہ تو اپنے لئے دیوار و در — تیری مٹی سے بنائے جائیں گے غیروں کے گھر

اے کہ جورِ آسماں سے ہے بہت بیزار و تنگ — اے کہ تیرا جام ہے فریادی بیداد سنگ

بے خبر! یہ نالہ و فریاد و ماتم کب تلک! — کب تلک یہ سینہ کوبیہائے پیہم کب تلک!

کوششِ پیہم میں پوشیدہ ہے مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق ہے در اصل قانونِ حیات

اٹھ کے پھر اک بار خلّاقِ جہاں تازہ ہو — آگ میں گر کر، چمن آرا خلیل آوازہ ہو

گر جہانِ نامساعد سے تجھے چارا نہیں — کیا یہ میداں میں سپر انداز ہو جانا نہیں؟

جو کوئی اپنی خودی سے ہے جہاں میں پختہ کار — ہوتی ہے اس کے موافق گردشِ لیل و نہار

اور اگر ہوتا نہیں اس کے موافق یہ جہاں
جنگ کرتا ہے وہ دورِ آسماں سے بے گماں

کھود کر رکھ دیتا ہے بنیادِ موجودات کو
اور عطا کرتا ہے اک ترکیبِ نو ذرّات کو

ڈھالتا ہے طرزِ نو میں گردشِ ایّام کو
اور بدل دیتا ہے یکسر چرخِ نیلی فام کو

اپنی قوت سے وہ کرتا ہے جہاں میں آشکار
وہ زمانہ، جو طبیعت سے ہو اس کی سازگار

آزماتا ہے جہاں میں صاحبِ قلبِ سلیم
کر کے اپنے زور کو صرفِ مہمّاتِ عظیم

ہے مزا الفت کا دشواری میں لے مردِ عقیل
پھول چننا آگ کے شعلوں سے مانندِ خلیل

قوتیں رکھتے ہیں پوشیدہ بہت مردانِ کار
جن کو کرنی ہے فقط مشکل پسندی آشکار

اور کم ظرفوں، کمینوں کا ہے شیوہ دشمنی
ہے اسی آئین پر موقوف ان کی زندگی

زندگانی ہے جہاں میں قوت و سطوت کا نام
اور سرمایہ ہے اس کا ذوقِ استیلائے تمام

عجزِ بے جا ہے دلیلِ سردیِ خونِ حیات
داغ دارِ سکتہ اس سے نبضِ موزونِ حیات

کاہلی سے جو کوئی قعرِ مذلت میں رہا
ناتوانی کا قناعت نام اس نے رکھ لیا

ناتوانی زندگی کی راہ کا رہزن ہے دیکھ
اور شکم خوف و ریا سے اس کا آبستن ہے دیکھ!

اس کا باطن ہے مکارم اور فضائل سے تہی
شیر سے اس کے ذمائم کو ہے حاصل فربہی

ہوشیار و باخبر! اے صاحبِ عقلِ سلیم!
بیٹھتا ہے سینکڑوں گھاتوں میں یہ پُرفن غنیم

گر بصیرت تجھ کو حاصل ہے فریب اس کا نہ کھا
مثلِ حربا رنگ ہر دم اس کا ہے بدلا ہوا

اس کی صورت کو خردمندوں نے پہچانا نہیں
کیونکہ بے پردہ کسی کو یہ نظر آتا نہیں

رحم اور نرمی کبھی بنتی ہے اس کی پردہ دار
اور کبھی یہ اوڑھ لیتا ہے ردائے انکسار

اس کا پردہ ہے کبھی مجبوری و بے چارگی
اور نقاب اس کا کبھی معذوری و بے مایگی

جب کہ تن آسانی کی صورت میں یہ ظاہر ہوا
صاحبِ قوت کا دل بھی ہاتھ سے جاتا رہا

اور توانائی جہاں بھی ہے صداقت ساتھ ہے
ساری خوبی دین اور دنیا کی اس کے ہاتھ ہے

زندگی ہے کشت زار، اور اس کا حاصل زور ہے
بلکہ تفسیرِ رموزِ حق و باطل زور ہے

مدعی، قوت کا جو دنیا میں مایہ دار ہے
اس کا دعویٰ بے نیازِ حجّت و تکرار ہے

زور سے ہوتی ہے باطل میں بھی پیدا شانِ حق
قوتوں سے اپنی کر دیتا ہے یہ بُطلانِ حق

اس کی کُن سے زہر ہو جاتا ہے کوثر کی مثال
خیر کو کہہ دے جو شر، ہو جائے شر بے قیل و قال

آہ! آدابِ امانت سے ہوا وہ بے خبر
جس کو خالق نے بنایا دو جہاں سے خوب تر

ایسا ناواقف نہ رہ تو زندگی کی راہ سے
اے مسلماں! ظالم و جاہل ہو غیر اللہ سے

اے برادر چشم و گوش و لب تو اپنے کھول دے
مجھ پہ ہنس لینا جو راہِ حق نہ مل جائے تجھے

حکایت ایک نوجوانِ مروزی کی جو حضرت سید مخدوم علی ہجویریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ظلم اعدا سے فریاد کرنے لگا۔

سیدِ ہجویرؒ، وہ آقا و مخدومِ امم
جس کی تربت پیرِ سنجرؒ کے لئے بیت الحرم

کر کے طے جس نے کہستانوں کا مشکل سلسلا
ہند کی بنجر زمیں میں تخم سجدہ بو دیا

زندہ اس کی ذات سے پھر عہد فاروقی ہوا
اس نے پھر دنیا میں حق کا بول بالا کر دیا

وہ جہاں میں پاسبانِ عزتِ اُم الکتاب
اس کی چشم حق نگر سے خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب اس مسیحا دم سے زندہ ہو گئی
نور سے اسکے ہماری صبح پیدا ہو گئی

عاشقِ کامل جہاں ہیں، قاصدِ طرّازِ عشق   آشکار اس کی جبینِ پاک سے اسرارِ عشق
آؤ، میں اس کی سناتا ہوں تمہیں اک داستاں   اک کلی میں بند کرتا ہوں گلستاں کا بیاں
اک جوانِ خوب جو قامت میں مثلِ سرو تھا   چل کے شہرِ مرو سے لاہور میں وارد ہوا
اور ہوا حاضر حضورِ سیدِ والا جناب   تا کرے دور اس کی تاریکی کو نورِ آفتاب
عرض کی حضرت سے محصورِ صفِ اعدا ہوں میں   ہر طرف پتھر کی بارش بیچ میں مینا ہوں میں
مجھ کو سکھلا دے خدارا اے شہِ گردوں مکاں   کس طرح رہتے ہیں زندہ دشمنوں کے درمیاں
پیرِ روشن دل، کہ اسکی ذات میں شانِ جمال   ایسی وابستہ جلال و شان سے تھی گویا جلال
یوں لگا کہنے کہ، اے نامحرمِ رازِ حیات   تیری نظروں میں نہیں انجام و آغازِ حیات
بے خبر! تو فارغِ اندیشۂ اغیار ہو   قوتِ خوابیدہ ہے تو بھی ذرا بیدار ہو
آپ پر جب دم گماں شیشہ کا پتھر نے کیا   شیشہ بن کر کیا لیا پھر ٹوٹ جانے کے سوا
راہ رو نے ناتواں اپنے کو جب باور کیا   اپنے نقدِ جاں کو رہزن کے حوالے کر دیا
کب تلک کہتا رہے گا آپ کو تو آب و گِل   بے خبر! ہے طور کے جلووں کا حامل تیرا دل

دوستوں سے کس لئے ہوتا ہے ایسا سرگراں
کس لئے ہوتا ہے ناداں شکوہ سنجِ دشمناں

تجھ سے سچ کہتا ہوں میں، دشمن بھی تیرا یار ہے
اس کی ہستی تیرے حق میں رونقِ بازار ہے

ہے جو اس دنیا میں دانائے مقاماتِ خودی
جانتا ہے فضلِ ایزد، ہے اگر دشمن قوی

کشتِ انساں کے لئے دشمن ہے مانندِ سحاب
اس سے امکاناتِ انسانی میں برپا انقلاب

سنگِ رہ ہوتا ہے پانی، ہے اگر ہمت قوی
کوہ و صحرا میں بھلا سیلاب رکتا ہے کبھی

سنگِ رہ ہوتا ہے مردوں کو فسانِ تیغِ عزم
قطعِ منزل سے ہے مقصد امتحانِ تیغِ عزم

مثلِ حیواں کھانا پینا اور سونا ہیچ ہے
گر خودی محکم نہیں تو تیرا ہونا ہیچ ہے

آپ کو اپنی خودی سے تو اگر محکم کرے
پھر اگر چاہے، جہاں کو درہم و برہم کرے

چاہتا ہے گر فنا تو آپ سے آزاد ہو
گر بقا منظور ہے تو آپ میں آباد ہو

موت ہے اپنی خودی کو بھول جانا جانِ من
تو سمجھتا ہے کہ مرنا ہے فراقِ جان و تن

پہلے یوسفؑ کی طرح اپنی خودی میں کر مقام
پھر اسیری سے شہنشاہی کی جانب کر خرام

پاس رکھ اپنی خودی کا اور مردِ کار ہو
مردِ حق بن جانِ من! اور حاملِ اسرار ہو

شرحِ رازِ عشق قصوں میں بیان کرتا ہوں میں
پھول کو زورِ نفس سے گلستاں کرتا ہوں میں

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں [1]

(مولانا رومؒ)

حکایت اُس پرندے کی جو پیاس کے مارے بیتاب تھا

اک پرندہ پیاس سے کچھ اس قدر بیتاب تھا
دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارۂ سیماب تھا

باغ میں ہیرے کا اک ٹکڑا نظر آیا اسے
پیاس کی شدت سے قطرہ آب کا سمجھا اُسے

کھا گیا کیسا فریب ریزۂ خورشید تاب!
سنگ پر اس مرغِ ناداں کو ہوا وسواسِ آب

لیکن اُس ہیرے سے وہ پانی نہ حاصل کر سکا
خوب ہی ٹھونگیں لگائیں اور تھک کر رہ گیا

اس سے وہ الماس بولا اے گرفتارِ ہوس!
اے کہ تو کرتا ہے مجھ پر تیز منقارِ ہوس!

بے خبر! پانی کا میں قطرہ نہیں، ساقی نہیں
میں جہاں میں دوسروں کے واسطے باقی نہیں

تو مرے در پے ہوا ہے کس قدر دیوانہ ہے!
کیوں حیاتِ خود نما کے راز سے بیگانہ ہے؟

زہرِ قاتل ہے یہ پانی آدمی کے واسطے
دیکھنا ٹکڑے نہ اڑ جائیں تری منقار کے

---

[1] ترجمہ ۔ ہے بہت اچھا محبت میں کہ رازِ دلبراں
دوسروں کی بات کے پردے میں ہو جائے بیاں

اس کا مقصد جبکہ ہیرے سے نہ حاصل ہو سکا — وہ پرندہ اس سے نا امید ہو کر چل دیا

جب کہ ارمانوں کا اس کے اس طرح خوں ہو گیا — نغمہ لب پر بن کے فریاد و فغاں آنے لگا

اتنے میں آیا نظر شبنم کا قطرہ پھول پر — تھا وہاں جو مثلِ اشکِ چشمِ بلبل جلوہ گر

اس کی آب و تاب تھی محوِ سپاسِ آفتاب — اور اس کے جسم پر غالب ہراسِ آفتاب

ایسا تارہ جسکی عادت رَم جو گردوں زادہ تھا — اور جو دم بھر نمائش کے لئے استادہ تھا

باغ میں آ کر فریبِ غنچہ دکھا گیا — زندگی سے اپنی کچھ بہرہ نہ حاصل کر سکا

دیکھنے میں جیسے اشکِ عاشقِ دلدادہ ہو — جو سرِ مژگاں ٹپکنے کے لئے آمادہ ہو

وہ پرندہ اڑ کے جب اس شاخ کے نیچے گیا — قطرۂ شبنم ٹپک کر اس کے منھ میں آ گرا

اے عدوئے جاں سے بچنے کے لئے مضطر ہے تو — پوچھتا ہوں تجھ سے میں، قطرہ ہے یا گوہر ہے تو؟

جب پرندہ پیاس کی شدت سے جاں بر لب ہوا — دوسرے کی زندگی کو اپنا سرمایہ کیا

قطرۂ نرم اندام و نازک تھا تو آخر مٹ گیا — ریزۂ الماس تھا موجود لیکن وہ نہ تھا

بے خبر حفظِ خودی کے راز سے اک دم نہ ہو — ریزۂ الماس ہو اور قطرۂ شبنم نہ ہو

پختۂ فطرت اس جہاں میں صورتِ کہسار بن
اور پھر تو حاملِ صد ابر گوہر بار بن

تو بھی اثباتِ خودی سے مرد خوش انجام ہو
بستہ کر پارے کو اپنے اور سیمِ خام ہو

اک نیا نغمہ سنا، لے ہاتھ میں سازِ خودی
برملا کہدے بس اب دنیا سے تو رازِ خودی

حکایت الماس و زغال

پھر میں رخسارِ حقیقت سے اٹھاتا ہوں نقاب
پھر سناتا ہوں تجھے اک داستانِ لاجواب

ایک دن کہنے لگا ہیرے سے معدن میں زغال
اے کہ تو سرمایہ دارِ جلوہ ہائے لازوال

یار ہیں، ہمدم ہیں، یکساں ہے ہماری ہست و بود
ایک ہے دنیا میں تیری اور مری اصلِ وجود

میری قسمت میں مگر لکھا ہے کیوں مرنا یہاں
اور تری قسمت میں ہو نازینتِ تاجِ شہاں؟

میں تو وہ بدشکل، بہتر ہے کہیں مجھ سے یہ خاک!
اور تیرے حسن سے آئینہ کا دل بھی ہے چاک

میری تاریکی سے روشن ہے بہت مجمر کا نام
اپنے جوہر کو جلا کر خاک کرنا میرا کام

مجھ کو ٹھکرا دیتے ہیں سب پائے استحقار سے
اور جلاتے ہیں مرا جی سینکڑوں آزار سے

اس سر و ساماں پہ مجھ کو کیوں نہ رونا چاہیے؟
کیا کسی کا یہ سر و ساماں بھی ہونا چاہیے؟

انجمادِ دود پر ہے زندگی کا انحصار
اک شرارِ جستہ کا لے دے کے ہیں سرمایہ دار

تیری صورت اور سیرت دونوں ہیں انجم مثال
نور پر نو جلووں کا مالک ہے ترا حسن و جمال

گاہ روشن تجھ سے آنکھیں قیصر و فغفور کی
گاہ زیبائش ہے تجھ سے دستۂ ساطور کی

یہ کہا ہیرے نے اس سے اے رفیق نکتہ بیں!
خاکِ تیرہ پختہ ہو کر بنتی ہے روشن نگیں

اپنے گرد و پیش سے ہوتی ہے جب مصروفِ جنگ
پختہ ہوتی ہے وہ اس پیکار سے مانندِ سنگ

پختگی سے میرا پیکر بھی سراپا نور ہے
میرا سینہ سینکڑوں جلووں سے رشکِ طور ہے

خوار ہے دنیا میں تو اپنے وجودِ خام سے
اور پڑا جلتا ہے اپنی نرمیِ اندام سے

کون کہتا ہے گرفتارِ غم و وسواس ہو
پختہ مثلِ سنگ ہو کر تو بھی اک الماس ہو

ہوتے ہیں اسکی ضیا سے دونوں عالم مستنیر
جو کہ ہوتا ہے جہاں میں سخت کوش و سخت گیر

سنگِ اسود کیا نہیں اک مشتِ خاک اے بے خبر!
وہ نکالا ہے گریبانِ حرم سے جس نے سر

رتبہ اس کا طورِ سینا سے مگر بالا ہوا
اس جہاں میں بوسہ گاہِ اسود و احمر بنا

الغرض ہے پختگی میں آبروئے زندگی
ناتوانی، ناکسی کی اصل ہے ناپختگی

شیخ و برہمن کی حکایت اور گنگا اور ہمالیہ کا مکالمہ

اس باب میں کہ حیاتِ ملّی کا تسلسل قوم کی روایاتِ مخصوصہ کے مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے پر موقوف ہے۔

اک برہمن تھا بنارس میں نہایت محترم
جو ہمیشہ رہتا تھا غرقِ یم بود و عدم

علم اور حکمت کا بھی رکھتا تھا سرمایہ بڑا
عارفانِ حق کا بھی دل سے ارادت مند تھا

ذہن تھا اس کا رسا اور فکر جدّت آفریں
عقل تھی چالاک اور ادراک تھا کیواں نشیں

تھا مکاں اس محترم کا صورتِ عنقا بلند
مہر و مہ تھے شعلۂ افکار پر اسکے سپند

ایک مدت کچھ نہ پایا خونِ ارماں کے سوا
معرفت کے جام سے بے بہرہ ساقی نے رکھا

بوستانِ علم و حکمت میں بچھا رکھا تھا جال
طائرِ معنیٰ کا تھا اس جال میں آنا محال

ناخنِ تدبیر خون آلود ہو کر رہ گیا
عقدۂ بود و عدم لیکن نہ اس سے کھل سکا

ایک دن آخر گیا اک عارفِ کامل کے پاس
مردِ صاحب حال یعنی شیخ اہلِ دل کے پاس

اور اس کی گفت گو کو غور سے سننے لگا
چپ رہا ایسا کہ گویا بت بنا بیٹھا رہا

شیخ یوں کہنے لگا اس طائرِ افلاک سے
باندھ لے ناداں ذرا عہدِ وفا اس خاک سے

جب سے تو آوارۂ کوہ و بیاباں ہو گیا
تیری پروازِ تخیّل کی نہیں کچھ انتہا

خاک کے ذرّوں سے ہو کر بے نیاز اے بیخبر!
فکرِ بے حاصل برائے گوہرِ انجم نہ کر!

میں نہیں کہتا بتوں سے دور ہو، بیزار ہو
تو جو کافر ہے تو پہلے لائقِ زنّار ہو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن ہو، سُن تو ذرا!
یوں نہ ٹھکرا مسلکِ آبا کو تو بہرِ خدا!

جب کہ ہے وابستہ جمعیت سے ملت کی حیات
کفر بھی سرمایہ جمعیت کا ہے اے نیک ذات!

جب کہ رسمِ کافری ہی میں ابھی کامل نہیں
تو یقیناً درخورِ طوقِ حریمِ دل نہیں

دور ہم تم جا پڑے ہیں جادۂ تسلیم سے
دور ہے آذر سے تو، میں دورِ ابراہیم سے

قیس ہی اپنا ابھی سودائی محمل نہیں
قیس ہو کر بھی جنونِ عشق میں کامل نہیں!

تو نے جب اپنی خودی کی شمع کو گُل کر دیا
آسماں پیما تخیّل ہو گیا، تو کیا ہوا!

تھام کر کہسار کے دامن کو دستِ موج سے
یوں ہمالہ سے کہا اک روز رودِ گنگ نے

"اے کہ ہے صبحِ ازل سے تو برابر یخ بدوش
اور دریاؤں سے ہے تیرا بدن زنّار پوش

حق نے گو تجھ کو کیا ہے محرمِ چرخِ بریں
پر تجھے حاصل خرامِ ناز کی لذّت نہیں

طاقتِ رفتار سے محروم تجھ کو کر دیا
اس وقارِ رفعت و تمکین میں آخر کیا ملا؟

زندگانی ہے جہاں میں حرکتِ پیہم کا نام
جس طرح ہے موج کی ہستی فقط اک رم کا نام"

کوہ نے دریا سے جب یہ طعنۂ بیجا سنا
مثلِ بحرِ آتشیں پُر غیظ ہو کر یوں کہا

"اے کہ خود کو دیکھتا ہوں میں ترے آئینے میں
تیرے جیسے سینکڑوں دریا ہیں میرے سینے میں

یہ خرامِ ناز ہے نادان! سامانِ فنا
کھو دیا جس نے خودی کو ہے وہ شایانِ فنا

تو، کہ ہے رازِ خودی سے مطلقاً ناآشنا
اس لئے نقصان کو سمجھا ہے تو نے فائدہ!"

مذہبِ ہندو میں تو لاریب گردوں زادہ ہے
پر یقیناً تجھ سے بہتر ساحلِ افتادہ ہے

تو نے قلزم کے حوالے اپنی ہستی کو کیا
آہ ناداں! نقدِ جاں کو نذرِ رہزن کر دیا!

مثلِ گل خود دار رکھ گلشن میں اپنے آپ کو
نشر بو کے واسطے منت کشِ گلچیں نہ ہو

زندگی در اصل اپنے آپ بڑھنے کا ہے نام
اور خیابانِ خودی سے پھول چننا اس کا کام

قرن گذرے اس طرح مجھ کو کھڑے اے پُر غرور
تو گماں کرتا ہے ہوں میں کس قدر منزل سے دور

میری ہستی بڑھتے بڑھتے ہو گئی گردوں مقام
گرد میری رفعتوں سے، ہے ثریا جس کا نام

اپنی ہستی کو کیا گلشن میں تو نے بے نشاں
اور ہے مسجودِ انجم میری چوٹی بے گماں

دیکھتی ہیں میری آنکھیں صاف اسرارِ فلک
کان سنتے ہیں مرے آوازِ پیرہائے ملک

جب سے سوزِ سعیِ پیہم نے جلایا ہے مجھے
آ پڑے لعل و گہر کے ڈھیر میرے سامنے

"در درونم سنگ و اندر سنگ نار
آب را بر نارِ من نبود گزار"[1]
(مولانا رومؒ)

ایک قطرہ ہی سہی تو آپ کو ضائع نہ کر
بڑھ کے قلزم سے برآرا ہو، طوفان سے نہ ڈر

آبِ گوہر کر کے حاصل تو بھی گوہر ریزہ ہو
اور کسی شاہد کے کانوں کے لئے آویزہ ہو

---

[1] ترجمہ۔ پتھروں میں میرے پنہاں آگ کو دیکھا نہیں؟ آگ تک میری گزر پانی کا ہو سکتا نہیں۔

یا بلند اپنی خودی کو کر، سبک ر فتار ہو
ابر برق انداز ہو یا ابرِ دریا بار ہو

تا سمندر تیرے آگے گدیۂ طوفان کرے
بلکہ تجھ سے شکوہ ہائے تنگیِ داماں کرے

اور کمتر آپ کو سمجھے وہ موج آب سے
خاکساری سے ترے قدموں میں آکر گر پڑے"

اس بیان میں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور جہاد، اگر اس کا محرک جوع الارض ہے تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

اے مسلمان! صبغۃ اللہ سے خودی کو رنگ دے
عشق کو سرمایۂ ناموس و نام و ننگ دے

عشق ہے مسلم کی فطرت میں تو اک قاہر ہے وہ
مسلم اور عاشق نہو، مسلم نہیں کافر ہے وہ

کام ہے مسلم کا ہر دم تابع حکم خدا
اُس کا کھانا، اُس کا پینا، اُس کا سونا، جاگنا

مرضیِ حق، مرضیِ مومن میں ہو جاتی ہے گم
بات کہ میری مگر باور بھی کر سکتے ہو تم؟

خیمہ زن میدانِ الا اللہ میں ہے، اسکی ذات
شاہدِ حق نوعِ انسان میں ہے وہ و الاصفات

چھوڑ قیل و قال تا حاصل مقام حال ہو
نور حق سے کر منور ظلمتِ اعمال کو

بادشاہی میں تجھے درویش رہنا چاہیے
یعنی حق بیں اور حق اندیش رہنا چاہیے

اپنے کاروبار کی غایت بنا قربِ خدا
جنگ بالکل خیر، اگر منظور ہے اس کی رضا

اور جو حق تلوار سے اس کی نہیں ہوتا بلند
جنگ کرنا قوم کے حق میں نہیں ہے سودمند

کیا سنا تو نے کبھی نامِ میاں میرِ ولی؟
ہر خفی تھا جس کے نورِ جاں سے دنیا میں جلی

اتباعِ مصطفیٰؐ میں جس کا ہر انداز تھا
نغمۂ عشق و محبت کے لئے اک ساز تھا

اس کی تربت آج بھی اس شہر کا ایمان ہے
مشعلِ نورِ ہدایت ہے ہمارے واسطے

جبہ فرسا آستاں پر جس کے ساتوں آسماں
تھا مریدِ کمتریں اس کا شہِ ہندوستاں

تھا مگر وہ بادشہ اک بندۂ حرص و ہوا
قصدِ تسخیرِ ممالک دل میں رکھتا تھا سدا

لحظہ لحظہ مانگتی تھی طمع اک شہر جدید
اور لبِ شمشیر پر تھا نغمۂ ہل من مزید

وہ زمانہ ہے کہ ہنگامے دکن میں ہیں بپا
اور اک لشکر شریکِ جنگ ہے اس شاہ کا

شیخ کی خدمت میں آیا وہ شہِ ہندوستاں
تا کہ ہو اس کی دعا سے کامیاب و کامراں

بھاگ آتا ہے مسلماں سوئے حق انجام کار
اپنی تدبیروں کو کرتا ہے دعا سے استوار

شیخ سن کر گفت گوئے شاہ کو خاموش تھا
اور بزمِ شیخ میں ہر اک سراپا گوش تھا

آن پہنچا اتنے ہی میں اک مرید باصفا
نذر اک چاندی کا سکّہ شیخ کو کرنے لگا

عرض کی منظور کر اے پیر! یہ نذرِ حقیر
اے کہ تو بھٹکے ہوؤں کا ہے جہاں میں دستگیر

ہو گیا ہے تن بدن محنت سے میرا چور چور
تب ہوا ہے یہ درم مجھ کو میسّر اے حضور!

شیخ نے فرمایا، یہ حق ہے ہمارے شاہ کا
جو کہ ہے پیراہنِ شاہی میں پوشیدہ گدا

گرچہ ہے وہ حکمرانِ انجم و خورشید و ماہ
ہے مگر نادار بھی سب سے سوا یہ بادشاہ

دوسروں کے خوان پر رکھتا ہے یہ اپنی نظر
اس کی جوع الارض سے ہے اک جہاں زیر و زبر

قحط اور طاعون اس کی تیغ کی برکات سے
اک جہاں ویرانہ اس کے شوقِ تعمیرات سے

خلق ہے فریادی کس درجہ اس نادار سے!
اس تہیدستی کے مارے، اس ضعیف آزار سے!

سطوت و شوکت ہے اس کی دشمنِ اہلِ جہاں
یہ ستمگر راہ زن، اور نوعِ انساں کا سوال

ہو کے بدمستِ خیالِ خود فریب و فکرِ خام
رکھتا ہے نادان یہ تاراج کا تسخیر نام

اک طرف ہے فوجِ شاہی اک طرف فوجِ غنیم
اس کی جوعِ ارض سے دونوں کا دل یکساں دو نیم

بھوک ہوتی ہے گدا کی آتش جانِ گدا
بھوک ہے سلطاں کی ملک و قوم کے حق میں قضا

غیرِ حق کے واسطے خنجر ہو جس کا بے نیام
ہے یقیں اول اسی کا کام ہو جائے تمام

میر نجات نقش بندؒ کی نصیحت جو بابائے صحرائی کے نام سے مشہور ہیں اور نصیحت مسلمانانِ ہند کے لئے تحریر فرمائی ہے۔

اے کہ مثلِ گل اُگا ہے خاک سے کچھ غور کر!
تیری پیدائش بھی ہے بطنِ خودی سے بیخبر!

تو خودی مت چھوڑ تا تیرا بقا انجام ہو
قطرہ بن کر رہ مگر ایسا کہ بحر آشام ہو

اے کہ انوارِ خودی سے مثلِ جامِ جم ہے تو!
گر خودی کو تو نے محکم کر لیا محکم ہے تو

فائدہ تیرا ہے جس میں، بس یہی سودا ہے وہ
جس کو یہ دولت ملے، سردار بن جاتا ہے وہ

ہست ہو کر نیستی سے تو ہراساں ہو گیا
اے ترے قربان کیوں اس درجہ ناداں ہو گیا!

سن رہا ہوں متّصل آوازِ سازِ زندگی۔
اس لئے تجھ سے بیان کرتا ہوں رازِ زندگی

ڈوب جا گو ہر صفت اپنی خودی میں بے عمل!
شوق سے پھر اپنی خلوت گاہ سے باہر نکل

اپنی خاکستر سے اے ناداں! شرار اندوز ہو — شعلہ بن کر اپنی گرمی سے نظر افروز ہو

چھوڑ دے یہ محنتِ چل سالہ اے مردِ گزاف! — شعلۂ جوالہ کے مانند کر اپنا طواف

زندگانی ہے طوافِ غیر سے چھُٹنے کا نام — جان لینا یعنی اپنے آپ کو بیت الحرام

بازوئے ہمت سے اُڑ، اس خاک سے آزاد ہو — مثلِ طائرِ بے نیازِ خطرۂ افتاد ہو

اور اگر طائر نہیں ہے تو، تو پھر بہرِ خدا — اس اندھیرے غار پر اپنا نشیمن مت بنا

اے کہ تو رکھتا ہے اپنے سر میں سودائے علوم! — میں سناتا ہوں تجھے غافل پیامِ پیرِ رومؒ

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود[1] (رومی)

کیا کبھی تو نے سنا ہے قصۂ مولائے رومؒ؟ — وہ، کہ تھا جس کا حلب میں مکتبِ درسِ علوم

پاؤں میں جس کے پڑی زنجیرِ توجیہاتِ عقل — جس کی کشتی ہو گئی طوفانی ظلماتِ عقل

ایسا موسیٰ جس نے دیکھا ہی نہیں سینائے عشق — جو نہیں واقف کہ ہے کیا لذتِ سودائے عشق

جو تشکک کا بیاں کرتا تھا یا اشراق کا — علم و حکمت کے پروتا تھا جو موتی بے بہا

وہ کہ حکمت اسکی مشائیں کی عقدہ کشا — ہر خفی کو جس کے نورِ فکر نے ظاہر کیا

---

[1] ترجمہ۔ علم اگر ہے تن کی خاطر تیرے حق میں مار ہے — دل کی خاطر ہے تو وہ تیرا رفیق و یار ہے

سامنے اس کے رہا کرتا تھا انبارِ کتب
اپنے مکتب میں بیاں کرتا تھا اسرارِ کتب

پیرِ تبریزؒ از رہِ تعمیلِ ارشادِ کمالؒ
ڈھونڈتا اک روز آیا مکتبِ ملا جلال

اور کہا رومیؒ سے یہ غوغائے قیل و قال کیا؟
یہ قیاس و وہم یہ برہان و استدلال کیا؟

مولوی صاحب نے فرمایا بس اے ناداں بول
کیا مقالاتِ خرد کو تو نے سمجھا ہے ٹھٹھول؟

میرے مکتب سے نکل جا بس اسی میں خیر ہے
تو ہے ناداں، جہل اور حکمت میں باہم بیر ہے

یہ ہمارا قال تیری فہم سے ہے ماورے
شیشۂ ادراک کو دیتا ہے یہ نور و صفا

شمس تبریزی نے جس دم یہ سنا طیش آ گیا
اور پیدا دل سے اس کے شعلۂ آتش ہوا

اور زمیں پر جا پڑی جس وقت وہ برقِ نظر
اس کے سوزِ دم سے اٹھے خاک سے اک دم شرر

آتشِ دل نے جلایا خرمنِ ادراک کو
اور خاکستر کیا اس دفترِ ناپاک کو

مولوی جو تھا ابھی بیگانۂ اعجازِ عشق
مطلقاً ناآشنائے نغمہائے سازِ عشق

بولا گھبرا کر کہ "یہ کیا تو نے اے ناداں کیا؟
دفترِ اربابِ حکمت نذرِ آتش کر دیا!"

شیخ نے اس سے کہا "اے کافرِ مسلم نما!
یہ ہے ذوق و حال، تو اس کو سمجھ سکتا ہے کیا!"

یہ ہمارا حال تیری فکر سے ہے مادری — غور سے دیکھے تو شعلے ہیں ہمارے کیمیا

تو نے اپنا ساز و سامان برفِ حکمت کو کیا — ہے تگرگ افشاں ہمیشہ ابر تیری فکر کا

آگ روشن کر کوئی اپنے خس و خاشاک سے — اور کر شعلہ کوئی تعمیر اپنی خاک سے

علمِ مسلم غیر سوزِ دل نہیں ہوتا تمام — اور اسلام اصل میں بس ترکِ آفل کا ہے نام

قیدِ آفل سے جو ابراہیمؑ نے پائی نجات
بن گئی آگ اس کے حق میں گلشنِ مینو صفات

علمِ حق کی تجھ کو اے ناداں! کچھ پروا نہیں — ایک روٹی کے لئے ہارا ہے تو نے نقدِ دیں

جستجوئے سرمہ رکھتی ہے تجھے زار و حزیں — اور اپنی سرمگیں آنکھوں سے تو واقف نہیں

شوق سے تو مانگ لے خنجر سے بھی آبِ بقا — اور دہانِ اژدہا سے آبِ کوثر کا مزا

سنگِ اسود مانگ جا کر بے دھڑک بتخانے سے — مشکِ نافہ کی تمنا کر سگِ دیوانہ سے

پر نہ لینا دانشِ حاضر کے آگے دل کا نام — معرفت کے کیف سے خالی ہے اس کا فکر کا جام

مدتوں مجھ کو تگ و دو میں رکھا ہے بیقرار — تب کہیں تہذیبِ حاضر کا ہوا ہوں رازدار

باغبانوں نے لیا ہے خوب میرا امتحاں
تب کیا ہے مجھ کو آخر رازدانِ گلستاں

لالہ زارِ درسِ عبرت ہے یہ گلزارِ خوشاب
کاغذی پھولوں کے مانند ایک نکہت کا سراب

گر گیا جس وقت نظروں سے مری یہ گلستاں
شاخِ طوبیٰ پر بنایا میں نے اپنا آشیاں

علمِ حاضر سے اے ناداں اٹھا بھاری حجاب
بت پرستی، بت فروشی، بتگری میں لاجواب

اس کو زندانِ مظاہر کی ہوا راس آگئی
اس حدودِ حس سے یہ باہر نہیں نکلا کبھی

راستے میں زندگی کے تھک کے آخر رہ گیا
اپنے ہاتھوں سے گلے پر اپنے خنجر رکھ دیا

آگ رکھتا ہے، مگر مانند لالہ سرد ہے
شعلہ رکھتا ہے، مگر مانندِ ژالہ سرد ہے

اس کی فطرت رہ گئی محرومِ سوزِ عشق ہے
اس جہانِ جستجو میں اس لیے ناشاد ہے

عشق ہے بے شبہ افلاطونِ علّتہائے عقل
عشق کے نشتر سے پُرخوں ہے، دلِ سودائے عقل

عالمِ کون و مکاں ساجد ہے یہ مسجود ہے
یہ جہاں میں سومناتِ عقل کا محمود ہے

یہ مے دیرینہ لیکن اس کی مینا میں نہیں
شورشِ یارب سے خالی اسکی راتیں رہ گئیں

مرتبہ شمشاد کا اپنے نہ سمجھا ارجمند
دوسروں کے سرو کو اس واسطے سمجھا بلند

مثل نے اپنی خودی سے آپ کو خالی کیا
اس لئے تو غیر کی آواز پر مرنے لگا

اے گدا کیوں ریزہ چیں ہے دوسروں کے خوان سے؟
جنس اپنی مانگتا ہے غیر کی دوکان سے!

بزم مسلم اور چراغِ غیر کیا اندھیر ہے!
آہ مسجد اور شرارِ دیر کیا اندھیر ہے!

رم کیا جس وقت آہو نے سوادِ کعبہ سے
چیر ڈالا اس کا پہلو ناوکِ صیاد نے

بو، نہیں تو گل بھی اجزائے پریشاں ہو گیا
بھاگنے والے خودی سے پھر خودی میں لوٹ آ

اے امینِ حکمتِ قرآں! ذرا ہشیار ہو
پھر خدارا ڈھونڈھ اپنی وحدتِ گم کردہ کو

تھا ہمارا پاسباں دنیا میں ملت کا حصار
ہو گئے کافر کہ چھوڑا ہم نے ملت کا شعار

کیا ہوئے وہ جام و مینا ساقی دیرینہ کے
اور خدا جانے وہ رندانِ حجازی کیا ہوئے

اب ہمارے ہی بتوں سے یہ حرم آباد ہے
خندہ زن ہے کفر بھی اسلام پر فریاد ہے!

شیخ نے ہارا بتوں کے عشق میں اسلام آہ!
ہاتھ میں تسبیح اور زنارِ اصنام آہ!

مو سفیدی کی کرامت ہی سے بن بیٹھے ہیں پیر
یوں گلی کوچوں میں ہیں وہ سخرۂ برنا و پیر

دل کہ نقشِ لا الٰہ سے یک قلم بیگانہ ہے
بو ہوس کے نو بنو اصنام کا بت خانہ ہے

جس کے لمبے بال ہیں بس ہے وہی اب خرقہ پوش
کس قیامت کے ہیں یہ سوداگرانِ دیں فروش

کرتے پھرتے ہیں مریدوں کو لیے ہر دم سفر
اور رموزِ دیانتِ ملت سے ہیں یکسر بے خبر

مثلِ نرگس ان کی آنکھیں نور سے محروم ہیں
اور سینے دل سے، اور دل سوز سے محروم ہیں

واعظِ ناداں کو بتخانے کا سودا ہو گیا
مفتیِ ملت نے اسکے حق میں فتویٰ دیدیا

اب بتاؤ اے ہمارے دوستو! ہم کیا کریں
حیب ہمارے پیر ہی رُخ سوئے میخانہ کریں

اَلوَقتُ سَیفٌ

عنبر آگیں ہو الٰہی خاکِ پاکِ شافعیؒ
اک جہاں ہے سرخوشِ صہبائے تاکِ شافعیؒ

عرش سے لایا ہے تارے توڑ کر فکرِ رسا
وقت کو تعبیر جس نے تیغِ بُرّاں سے کیا

مجھ سے کیا تعریف ہو سکتی ہے اس تلوار کی
اس کی آب دیتا ہے سرمایہ دارِ زندگی

اس کے مالک کو نہیں اندیشۂ بیم و رجا — ہاتھ اس کا ہے یدِ بیضا سے بھی روشن سوا

سنگِ خارا سے رواں چشمے ہوں اسکی ضرب سے — وہ اگر چاہے تو دریا ایک دم صحرا بنے

حضرتِ موسیٰؑ کے قبضے میں یہی شمشیر تھی — معنیٔ تقدیرِ خالق جن کی ہر تدبیر تھی

چاک اس نے سینۂ دریائے احمر کر دیا — اک سمندر خشک مثلِ خاک ہو کر رہ گیا

پنجۂ حیدرؓ کہ جو مشہور خیبر گیر تھا — جانتے ہیں سب کہ مالک تھا اسی شمشیر کا

گردشِ گردونِ گرداں دیدنی ہے اے عزیز! — انقلابِ روز و شب تیرے سمجھنے کی ہے چیز

کیوں اسیرِ دوش و فردا ہو گیا انساں ہے دیکھ! — تیرے دل میں بھی نرالا اک جہاں پنہاں ہے دیکھ

اپنے آب و گل میں تو نے تخمِ ظلمت بو دیا — آہ ظالم وقت پر تو نے گماں خط کا کیا

لے کے اپنے ہاتھ میں پیمانۂ لیل و نہار — فکر تیرا ناپتا رہتا ہے طولِ روزگار

رشتۂ اوقات کو تو نے کیا زنارِ دوش — عشق میں اصنامِ باطل کے گنوائے اپنے ہوش

کیمیا تھا تو، مگر اک تودۂ گِل ہو گیا — سرِّ حق پیدا ہوا تھا، حرفِ باطل ہو گیا

تو مسلماں ہے تو بس اب توڑ اس زنار کو — اور ضیائے شمعِ بزمِ ملتِ احرار ہو

تو کہ سمجھا ہی نہیں نادان معنیٔ وقت کے   کیسے واقف ہو حیاتِ جاوداں کے راز سے؟

روز و شب کی قید میں سمجھے گا کیا اندازِ وقت   لِی مَعَ اللّٰہ سے سمجھ، گر ہے سمجھنا رازِ وقت

ایں و آں پیدا ہوئے ہیں وقت کی رفتار سے   زندگی خود راز ہے اک وقت کے اسرار سے

اور اصلِ وقت یہ خورشید ہو سکتا نہیں   وقت ہے جاوید، یہ جاوید ہو سکتا نہیں

عیش اور غم، عید اور عاشورہ کیا ہے؟ وقت ہے   اور یہ تابِ مہ و خورشید کیا ہے؟ وقت ہے

وقت کو مثلِ مکاں تو نے جو سمجھا حیف ہے!   اور پھر یہ امتیازِ دوش و فردا حیف ہے!

ایک مثلِ بو، کیا رم تو نے اپنے باغ سے   آپ ہی زنداں بنایا آہ! اپنے واسطے

وقت اپنا۔ ہے نہ جس کی ابتدا و انتہا   جو ہمارے ہی ضمیروں کے خیاباں سے اُگا

زندہ ہوجاتا ہے اس کی معرفت سے زندہ تر   کیسا زندہ؟ جس کی ہستی صبح سے تابندہ تر

زندگی ہے یہ زمانہ اور زمانہ زندگی

اس پہ شاہد لَاتَسُبُّوا الدَّھرَ فرمانِ نبیؐ

تجھ سے کرتا ہوں بیاں اک نکتہ روشن مثلِ دُر   تا تجھے معلوم ہو جائے تمیزِ عبد و حُر

عبد کو کر لیتے ہیں گم آپ میں لیل و نہار
اور حُر کے دل میں ہو جاتا ہے گم یہ روزگار

مشغلہ ہے عبد کا . بننا کفن ایام کا!
اور روز و شب کی چادر اپنے اوپر تانا

اور حُر اس آب و گِل کے دام میں پھنستا نہیں
بلکہ چھا جاتا ہے وہ کون و مکاں پر بالیقیں

عبد طائر کی طرح محبوس دامِ صبح و شام
لذتِ پرواز اس کی جان پر یکسر حرام

اور دیکھو! سینۂ آزادۂ جا بک نفس
طائرِ ایام جس میں بند ہے، ایسا قفس

عبد کی فطرت کا حاصل دیکھئے تو کچھ نہیں
وارداتِ نو بنو سے بے خبر، زار و حزیں

ایک ہے اس کا گرانباری سے ہر لحظہ مقام
ایک حالت پر ہیں اس کے نالہ ہائے صبح و شام

کام ہے حُر کا مگر نو آفرینی دم بدم!
تازہ نغموں کا ہمیشہ حامل اس کا زیر و بم

اس کی فطرت بے نیازِ زحمتِ تکرار ہے
راستہ کب اس کا مثلِ حلقۂ پرکار ہے!

عبد کے حق میں زمانہ پاؤں کی زنجیر ہے
اور زباں پر اس کی ہر دم شکوۂ تقدیر ہے

مردِ حُر کی ہمتِ عالی قضا کی راز دار
اس کے ایما سے ہیں گویا حادثاتِ روزگار

ماضی و آئندہ اس کے حال میں موجود ہیں
دیر کتنے ہوں مگر اس کے لئے سب زود ہیں

یہ سخن میرا مگر صوت و صدا سے پاک ہے
بے خبر اس جا خرد عاجز یہاں ادراک ہے

حرف کار رد ناکہ ہے معنی کے آگے شرمسار
شکوۂ معنی کہ ہے کب حرف اس کو سازگار

معنی زندہ جب آیا حرف میں مردہ ہوا
شعلہ اس کا سانس کی ٹھنڈک سے افسردہ ہوا

تیرا دل ہے رازدارِ نکتۂ غیب و حضور
تیرا دل گنجینۂ اسرارِ ایام و مرور

نغمۂ خاموش رکھتا ہے جہاں میں سازِ وقت
غوطہ زن ہو دل میں مل جائے گا تجھ کو رازِ وقت

یاد ہیں ہم کو ابھی وہ دن کہ تیغ روزگار
تھی ہماری قوتِ بازو کی یارِ سازگار

ہم نے بویا تھا دلوں کی سرزمیں میں تخمِ دیں
چہرۂ حق سے اٹھایا پردہ ہم نے بالیقیں

عقدۂ عالم کیا حل ناخنِ تدبیر سے
کھول دی قسمت جہاں کی نغمۂ تکبیر سے

بادۂ گلگوں خمِ حق سے پیا جی کھول کر
اور پھر اُس نے میکدوں کو کر دیا زیر و زبر

ایک اب صہبائے دیرینہ تری مینا میں ہے
شیشہ بھی پانی ہو وہ گرمی تری صہبا میں ہے

کس لئے اس درجہ تجھ کو نخوت و پندار ہے
کس لئے ہے طعنہ زن مسلم! اگر نادار ہے

زیبِ محفل تھا ہمارا جام بھی اے بے خبر! ہم بھی رکھتے تھے کبھی پہلو میں دل تو یاد کر!

عصرِ نَو جو سینکڑوں جلوؤں سے ہے آراستہ یہ ہمارے ہی غبارِ راہ سے پیدا ہوا

کشت زارِ حق کو سینچا ہم نے اپنے خون سے ہے جہاں ممنون ہماری حق نمائی کے لئے

ہم نے ہی یوں صاحبِ تکبیر عالم کو کیا خاک سے اپنی رکھی ہم نے ہی کعبوں کی بِنا

حرفِ اقراء حق تعالیٰ نے سکھایا تھا ہمیں اور اپنے رزق کا قاسم بنایا تھا ہمیں

چھن گیا ہاتھوں سے اپنے آج گو تاج و نگیں یہ گدا تیری حقارت کے مگر شایاں نہیں

تیری نظروں میں زیاں اندیش ہیں بیکار ہیں بے سروساماں ندامت آشنا و خوار ہیں

ہم کو حاصل ہے مگر وہ اعتبارِ لا الٰہ کائناتِ ہر دو عالم رکھتے ہیں زیرِ نگاہ

واسطہ اب کیا غمِ امروز و فردا سے رہا؟ ہم نے باندھا ہے کسی کے ساتھ پیمانِ وفا

سینۂ عالم میں ہیں ہم سِرِّ مکنونِ خدا وارثِ موسیٰؑ و ہارونؑ ہم کو خالق نے کیا

چاند اور سورج میں ہے اب بھی ہماری آب و تاب اب بھی رکھتا ہے ہزاروں بجلیاں اپنا سحاب

ذات ہے اپنی جہاں میں ذاتِ حق کا آئینہ
ہستیٔ مسلم ہے اک آیاتِ حق کا آئینہ

دُعا

اے دلِ و جانِ وجودِ عالمِ امکاں ہے تو — ہم سے کیوں بیزار ہے آخر ہماری جاں ہے، تو
نغمہ پرور فیض سے تیرے ربابِ زندگی — موت تیرے راستے میں کامیابِ زندگی
پھر خدارا آ کے تسکینِ دلِ ناشاد کر — یعنی پھر سینوں کو اپنے عشق سے آباد کر
چھین لے پھر ہم سے اس سودائے ننگ و نام کو — پختگی کر دے عطا پھر عاشقانِ خام کو
شکوہ ہم رکھتے ہیں اپنے بختِ نافرجام سے — ہے کمند اپنی بہت کوتاہ تیری بام سے
کیوں چھپاتا ہے تہی دستوں سے تو اپنا جمال — کر عنایت ہم کو ارزاں عشقِ سلمانؓ و بلالؓ
چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب ہم کو بخش دے — پھر ہماری فطرتِ سیماب ہم کو بخش دے
ہم کو دکھلا دے الٰہی! پھر وہ آیاتِ مبیں — سامنے ہو منظرِ ”اَعْنَاقِ اَعْدَا خاضعین“
کوہِ آتش خیز کر دے پھر ہماری کاہ کو — پھر جلا دیں ہم اسی آتش میں غیر اللہ کو
چھوڑ دیں وحدت کی راہیں جب ہماری قوم نے — رشتۂ مقصود میں عقدے ہزاروں پڑ گئے
اب ستاروں کی طرح ہم ہیں پریشاں سربسر — اصل میں سب ایک اور بیگانہ ہیں باہمدگر

پھر اوراقِ پریشاں کا وہی شیرازہ ہو! پھر وہی دنیا میں آئینِ محبت تازہ ہو!

ہم سے جو خدمت کبھی لی تھی خدارا پھر بھی لے یعنی اپنا کام اپنے عاشقوں کو سونپ دے

راہرو ہیں ان کو پہونچا منزلِ تسلیم پر پھر عطا ان کو وہی ایمانِ ابراہیمؑ کر

اور لاؔ کے شغل سے آگاہ کر دے عشق کو

آشنائے رمزِ الّا اللہ کر دے عشق کو

میں کہ اوروں کے لئے جلتا ہوں یارب شمع سا اور سکھاتا ہوں طریقِ گریہ و آہ و فغاں

مجھکو وہ آنسو عطا کر دے جو دل افروز ہوں بے قرار و بے سکوں، بیتاب و راحت سوز ہوں

باغ میں بودوں میں انکو اور پیدا آگ ہو آگ دھو ڈالے قبائے لالہ سے جو داغ کو

دوش کی جانب ہے، دل، آنکھیں سوئے فردا لگیں اس طرح ہوں درمیانِ انجمن تنہا نشیں

"ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من اندرونِ من نجست اسرارِ من"[1]

آہ! دنیا میں نہیں ملتا کوئی اپنا ندیم نخلِ سینا ہوں مگر پیدا نہیں میرا کلیم!

کیسا ظالم ہوں کہ میں خود پر جفا کرتا رہا! آگ کے شعلے کو اپنی گود میں پالا کیا!

---

[1] ترجمہ۔ جس کو دیکھو، ہے گماں سے اپنے، میرا ہم نشیں حیف! لیکن کوئی میرے راز کا جویا نہیں

آگ بھی کیسی جو ہے غارت گرِ سامانِ ہوش
آج ہے شعلہ اسی کا اور مرا دامانِ ہوش

عقل کو جس نے جنوں کا راستہ بتلا دیا
علم کا جس نے متاعِ زندگی غارت کیا

ہو گیا خورشید جس کے سوز سے گردوں مقام
بجلیوں کا طوف ہیں جس کے ہمیشہ اژدہام

پہلے شبنم کی طرح میں دیدۂ گریاں ہوا
بعد مدت پھر امینِ آتشِ پنہاں ہوا

میں نے شمعِ بزم کو سوزِ عیاں سکھلا دیا
خود مگر دنیا کی نظروں سے نہاں جلتا رہا

ہو گیا آخر مرا ہر موئے تن آتش فشاں
اور رگِ اندیشہ سے ہونے لگے شعلے عیاں

میرا بلبل دانہ چینِ خرمنِ آتش ہوا
اس نے پھر آتش مزاج اک نغمہ پیدا کر دیا

عہدِ حاضر میں ہے سب کچھ ایک دل پیدا نہیں
مضطرب مجنوں کہ محمل ہے مگر لیلیٰ نہیں!

اس طرح تنہا تڑپنا شمع کو آساں نہیں
آہ! اک پروانہ دنیا میں مرے شایاں نہیں

کب تلک کرتا رہوں میں انتظارِ غمگسار؟
کب تلک کرتا رہوں میں جستجوئے رازدار؟

اے رُخِ روشن سے تیرے ماہ و انجم کو ضیا!
چھین لے مجھ سے مجھے کیوں تو نے یہ شعلہ دیا

باز آیا اس سے میں اپنی امانت کو سنبھال
خارِ جوہر کو مرے آئینۂ دل سے نکال

یا مجھے للہ کوئی ہمدم دیرینہ دے
مجھ کو میرے عشق عالم سوز کا آئینہ دے

موج کو دیکھو تو ہے دریا میں ہم پہلوئے موج
موج سے مل کر محبت میں تڑپنا خوئے موج

آسماں پر ہے ستارے کا ستارہ ہمنشیں
رات کے زانو پہ رہتا ہے سرِ ماہِ مبین

دیکھیئے دن کو تو ہے وہ رات کا پہلو نشیں
اور فردا کے سبب امروز بھی تنہا نہیں

نہر کو دیکھا ہے اکثر نہر میں ہوتے فنا
بو، میں گم دیکھی ہے ہوتے موجۂ بادِ صبا

زندگی کا ہے مزا مستوں کو پیمانے کے ساتھ
رقص کرتا ہے ہر اک دیوانہ دیوانے کے ساتھ

تو، کہ اپنی ذات میں یکتا ہے بیچوں وچرا
تو نے بھی عالم کو اپنے واسطے پیدا کیا

آہ! دنیا میں مثالِ لالۂ صحرا ہوں میں
اس بھری محفل میں یعنی بیکس و تنہا ہوں میں

دے مجھے بھی کوئی ہمدم اے مرے پروردگار
جو مرے آئینۂ دل کا بنے آئینہ دار

وہ مرا ہمدم مگر دیوانۂ فرزانہ ہو
جو خیال این و آں سے یک قلم بیگانہ ہو

تاکہ اس کی جاں کو اپنی ہوئے وحشت سونپ دوں
اس کے دل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لوں

اپنی مٹی سے بناؤں پیکر اس محبوب کا
خود صنم اس کا بنوں خود ہی برہمن باوفا

اقبالؔ

رموزِ بیخودی

مترجم

کوکب شادانی

فہرس

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	پیش لفظ	ا	۱۵	وطن اساس ملت نہیں ہے	۳۶
۲	پیش کش بہ ملت اسلامیہ	۱	۱۶	نظام ملت الخ	۴۲
۳	مفہوم ربطِ فرد و ملت	۵	۱۷	زمانۂ انحطاط الخ	۴۵
۴	ملت اختلاط افراد سے الخ	۸	۱۸	سیرت ملی الخ	۴۸
۵	ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی	۱۱	۱۹	حسن سیرت ملیہ الخ	۵۱
۶	یاس و حزن الخ	۱۵	۲۰	بیان حیات ملیہ الخ	۵۵
۷	تیر کی شمشیر سے گفتگو	۱۷	۲۱	حقیقی جمعیت ملی الخ	۵۹
۸	حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ	۱۸	۲۲	توسیع حیات ملی الخ	۶۴
۹	رسالت	۲۱	۲۳	حیات ملیہ کا کمال الخ	۶۸
۱۰	بیان مقصود رسالت	۲۴	۲۴	نوع انسانی کی بقا الخ	۷۲
۱۱	بو عبید اور جابان	۲۶	۲۵	مسلمان عورتوں کے لئے الخ	۷۵
۱۲	سلطان مراد اور معمار	۲۸	۲۶	خطاب بہ مخدرات اسلام	۷۷
۱۳	بیان حریت اسلامیہ الخ	۳۰	۲۷	مثنوی کے مطالب کا خلاصہ	۷۸
۱۴	ملت محمدیہ کی بنیاد	۳۳	۲۸	عرض حال بحضور رحمۃ للعالمینؐ	۸۹

پیش لفظ

علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام کے جو ترجمے اب تک شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد غالباً علامہ موصوف کے مختلف فارسی مجموعہ ہائے کلام کی تعداد سے زیادہ ہی ہو گی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان ترجموں کے فاضل مترجمین نے اپنی ان مساعی جمیلہ کے ذریعہ علامہ اقبال کی صحیح ترجمانی کا حق کہاں تک ادا کیا ہے۔

جیسا کہ قارئین کرام کو علم ہے ترجمہ بجائے خود ایک فن ہے اور اس میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان سے بھی قارئین کرام بخوبی واقف ہونگے بہر حال سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ کسی زبان کے کسی مضمون، مقالے، نظم و نثر کی کسی کتاب یا اس کے کسی جزو کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔ دوسرے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ مترجم جن مضامین، مقالوں، کتابوں یا ان کے جن اجزا کا ترجمہ پیش کر رہا ہے ان کے مطالب و مفاہیم کا ادراک اسے کہاں تک حاصل ہے۔ مثلاً قرآن مجید کے ترجمے کے لئے کلام الٰہی کے مفاہیم کا ادراک، کسی تفسیر کے ترجمے کے لئے مختلف تفاسیر کا مطالعہ، منطقی موضوعات پر کسی کتاب کے ترجمے کے لئے منطق اور اصول منطق سے واقفیت، احادیث کے ترجمے کے لئے حدیث و اصول حدیث کا علم، سائنسی مضامین یا علم فلسفہ پر کسی کتاب کے ترجمے کے لئے ان مضامین کے حقائق و رموز کے استنباط کی صلاحیت اور فقہی کتابوں کے ترجمے کے لئے فقہ اور اصول فقہ پر گہری نظر ہونا ناگزیر ہے۔ علیٰ ہذ القیاس تصوف طبیعات، مابعد الطبیعات، ہیئت، نجوم، طب، نفسیات، علم الارض، علم الحیوانات، نباتیات،

کیمیا، ریاضی، علم الما، تجربات، ہندسہ، علم کلام اور دیگر مذہبی علوم یا معارف علوم الٰہیہ وغیرہم پر کسی کتاب کے ترجمے کے لئے لازم ہے کہ مترجم نہ صرف اس مخصوص علم کے اصول و مبادیات سے واقف ہو بلکہ ان پر گہری نظر رکھتا ہو۔ نیز جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں مترجم کے لئے دونوں زبانوں پر یعنی اس زبان پر جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے عبور حاصل ہونا ایک امر لابدی ہے جس کے بغیر ترجمے کی کوشش سعی رائیگاں کے مترادف ہوگی۔

ادبیات خصوصاً منظوم ادبیات کے تراجم کے سلسلے میں ترجمہ کی دقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اصل مصنّف یا شاعر اپنی زبان میں مہارت رکھنے کے علاوہ علم بیان و معانی پر بھی عبور رکھتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے شہ پاروں میں اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا کے مصداق جادو جگاتا ہے۔ اسی لئے مشاہیر ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ادبی ترجموں میں اصل ادبی شہ پاروں کی روح شاذ و نادر ہی باقی رہتی ہے۔ اُردو میں علامہ علی حیدر نظم طباطبائی مرحوم کا ترجمہ جو انگریز زبان کے مشہور شاعر گرے (Gray) کی ایک حزنیہ نظم (Elegy) کا منظوم ترجمہ ہے اور "گورِ غریباں" کے نام سے شائع ہو کر عالمی شہرت حاصل کرچکا ہے ترجمے کی ایک نادر مثال ہے۔

علامہ اقبالؒ کا تمام تر فارسی کلام فلسفہ کے مضامین سے پڑ ہے لیکن ان مضامین کو اشعار کا خوبصورت لباس پہنا کر موصوف نے گویا بادۂ خودی کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ یہی وہ بے مثل آرٹ ہے جس کے ذریعہ اقبالؒ کے پیر معنوی مولانا جلال الدین رومیؒ نے شراب علم و معرفت کے دریا بہائے ہیں ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآں در زبان پہلوی

یہی قول حق علامہ اقبالؒ کے کلام پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے جس میں موصوف نے قرآن پاک سے ہٹ کر بقول خود ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے اور جیسا کہ خود فرمایا ہے انھوں نے شاعری کو صرف حدی خوانی کا ذریعہ بنایا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے مہار را

اسی بنا پر راقم الحروف نے ایک نظم میں اقبالؒ کو مخاطب کر کے عرض کیا تھا کہ ؎

ہے زمانے میں مسلّم فلسفہ دانی تری
ہم کو پیاری ہے مگر رسم حدی خوانی تری

لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبالؒ کا مرتبہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم ہے۔ وہ اُردو کی طرح فارسی زبان پر بھی کلّی عبور رکھتے ہیں اور فارسی نظم میں علم فلسفہ کی موشگافیوں کے لئے "شاعر مشرق" نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس کی مثال فارسی کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے ہاں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ فارسی اشعار میں فلسفے کے دقیق ترین نکات کے بیان میں ان کے اسلوب اظہار اور اس پر ان کی مہارت تامّہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں فلسفے میں اقبال کا موضوعِ خاص "خودی" (ego) ہے۔ "اسرارِ خودی" کے علاوہ "رموزِ بیخودی" میں بھی آپ کو "خودی" کے جلوے جا بجا بے نقاب نظر آئیں گے۔ "جاوید نامہ" اور "زبورِ عجم" میں ان جلووں کی تابانی بے پناہ ہو گئی ہے جن کی تاب لانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں چہ جائے کہ ان تابانیوں کا تجزیہ کر کے انھیں کسی دوسری زبان میں پیش کیا جائے۔

دورِ حاضر میں ہندوستان کو تو چھوڑیئے خود اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسلمانوں کو

قرآنی علوم اور عربی و فارسی سے جس قدر دلچسپی رہ گئی ہے اس کا علم کسے نہیں۔ اسی لئے راقم الحروف کی ناچیز رائے ہیں اردو میں کلام اقبال کے تراجم کا واحد مقصد یہی ہے کہ موصوف کے پیغام کو عام کیا جائے اور "خودی" کے سلسلے میں ان کی فلسفیانہ موشگافیوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ عوام الناس بھی ان سے مستفید و مستفیض ہو سکیں۔ اس سلسلے میں منظوم تراجم کی افادیت سے کسے انکار ہوگا لیکن یہ خیال رہے کہ مترجمین کی مساعی پُر خلوص ہونے کے باوجود کلام اقبالؒ کو کہیں چیستاں نہ بنا دیں اور وہ قدیم ایرانی فلسفے کی مشہور کتاب ژند کی شرح پاژند کا مصداق نہ ہو جائے۔ اس اندیشے کی سب سے بڑی وجہ اقبالؒ کے فارسی کلام کے وہ منظوم اردو تراجم ہیں جو اب تک ہمارے سامنے آئے ہیں اور جن میں باستثنائے چند فاضل مترجمین ایک ایک شعر کا اکثر و بیشتر کئی کئی اشعار میں ترجمہ کرنے کی کوشش کے باوجود مفاہیم اقبالؒ کو سمجھنے اور سمجھانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔

واضح رہے کہ علامہ اقبالؒ نے خودی و بیخودی کے اسرار و رموز کو عام فہم بنانے کے لئے کہیں کہیں خود سوالات قائم کئے ہیں۔ اور پھر ان کے مفصل جوابات دیئے ہیں جیسے "زبور عجم" کے ایک جزو "گلشن راز جدید" میں[1] لیکن کچھ دوسرے مقامات پر مزید وضاحت کی غرض سے علم ریاضی کی طرح کچھ مفروضات قائم کئے ہیں۔ مثلاً "جاوید نامہ" کے مختلف حصص میں علامہ موصوف نے یہی طریقہ برتا ہے۔ اور جن دقیق مسائل کو ملتِ اسلامیہ کے استفادے کے لئے حل فرمایا ہے انہیں "حدیث دیگراں" کے طور پر تمثیلاً (ALLEGORICALLY) پیش کیا ہے۔

---

[1] راقم الحروف کی طرف سے اس جزو کے منظوم اردو ترجمے کی حقیر کوشش "اقبال ریویو" بابت ماہ جنوری ۱۹۷۳ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

راقم الحروف نے زیرِ نظر منظوم اردو ترجمے میں محسنِ ملت اقبالؒ کی ان وجدانی کیفیات کو ظاہر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ قارئین کرام سطور بالا کی روشنی میں راقم الحروف کی ان ذہنی کاوشوں اور دشواریوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اسے اس ترجمے میں پیش آئی ہوں گی۔ فنِ ترجمہ میں اپنی ہیچ میرزی کے اعتراف کے ساتھ زیرِ نظر ترجمے کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ میں قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔

آخر میں میں برادر محترم رئیس امروہوی، محترم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رئیس شعبۂ اردو جامعہ کراچی، محترم بزرگ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب اور مخدومی پروفیسر مسلم صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے راقم الحروف کو اپنی گراں قدر آرا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ اقبال اکادمی پاکستان نے زیرِ نظر ترجمے کی اشاعت کا بندوبست فرما کر میری اس حقیر خدمت کا جس انداز میں اعتراف فرمایا اس کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکر گذاری ہوگی۔ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہ۔

احقر العباد

کوکب شادانی

۱۵/ ۸۶۳، دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

اپریل ۱۹۷۵ء

رموزِ بیخودی

(ترجمۂ منظوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش کش بہ ملّتِ اسلامیّہ

اے کہ تو خود خاتمِ اقوام ہے
تجھ پہ ہر آغاز کا انجام ہے
رتبہ نبیوں کا ترے پاکوں کا ہے
دل فقط تیرے جگر چاکوں کا ہے
تو شہیدِ حسنِ نَترسازادہ ہے
تو رہِ کعبہ سے دور افتادہ ہے
تیرے کوچے کا فلک مشتِ غبار
تیرے رخ پر ہے نگاہِ روزگار

موج کی صورت ٹھہرنا شاق ہے
کس کے نظّارے کا تو مشتاق ہے؟

پیرویِ سوزشِ پروانہ کر
برق میں تعمیرِ نو کاشانہ کر

عشق سے کر جان کو اک جانِ نو
مصطفیٰؐ سے باندھ تو پیمانِ نو

میں نے جب دیکھا رخِ زیبا ترا
صحبتِ ترسا سے دِل گھبرا گیا

ہم نوا خوش جلوۂ اغیار سے
داستانِ گیسو و رخسار سے

پیشِ ساقی جب جبیں فرسا ہوئے
قصّۂ مغ - زادگان کہنے لگے

میں ہوں تیری تیغِ ابرو کا شہید
خاک کو میری ترا کوچہ ہے عید

مدح گوئی سے بہت بالا ہوں میں
غیر کے آگے کہاں جھکتا ہوں میں

جب سخن نے کر دیا آئینہ ساز
کیوں سکندر سے نہ ہوتا بے نیاز

بارِ احساں میری گردن پر نہیں
کوئی دھبّہ میرے دامن پر نہیں

مثلِ خنجر سخت کوشی میری جاں
آب دیتا ہے مجھے سنگِ گراں

میرے دریا میں نہیں بے تابیاں
کاسۂ گرداب ہے مجھ پر گراں

ہوں حجابِ رنگ، میں کب ہوں شمیم
میں نہیں پابندِ امواجِ نسیم

اِس شرر آباد میں اخگر ہوں میں
خود ہی خلعت یابِ خاکستر ہوں میں

تیرے در پر ہوں مگر یکسر نیاز
لے کے آیا ہوں فقط سوز و گداز

آسماں سے بارشیں ہوتی ہیں جب
میرے دل پر ہی برس جاتی ہیں سب

میں انھیں کرتا ہوں جوئے نرم رو
پھیرتا ہوں تیری جانب جو بہ جو

تو مرے محبوب کا محبوب ہے
میرے پہلو میں دلِ مطلوب ہے

جب سے ڈالی عشق نے طرحِ فغاں
دل کا آئینہ بنا اشکِ رواں

نازشِ سینہ جو تھا میرے لئے
پیش کرتا ہوں وہ آئینہ تجھے

تا کہ اپنا چہرہ اس میں دیکھ لے
اور اپنی ذات کا قائل بنے

قصّۂ پارینہ، بن جائے چراغ
تازہ ہو جائیں ترے سینے کے داغ

قوم نامحرم تھی اپنی ذات سے
زندگی میں نے طلب کی اِس لئے

میں سکوتِ شب میں بھی نالاں رہا — خواب میں دنیا تھی، میں گریاں رہا
دل سکون و صبر سے محروم تھا — وردِ لب یَا حَیُّ وَیَا قَیُّوْمُ تھا
آرزو تھی خون ہو جائے اگر — اس کو آنکھوں سے بہا دوں سر بسر
تا کجا جلتا ہی میں پیہم رہوں؟ — صبح سے میں طالبِ شبنم رہوں؟
اشک ریزی شمع ساں کرتا رہوں؟ — ہر شبِ تاریک سے الجھا رہوں؟
جلوہ افزاں بن گئی میری کمی — بزم کی رونق ہے میری برہمی
سوز سے خالی مرا سینہ کہاں! — اب مرے ہفتہ میں آدینہ کہاں!
جسمِ فرسودہ میں رشتہ جان کا — آہ کا جلوہ ہے گرد آلود سا
جب مجھے صبحِ ازل پیدا کیا — نالہ حق نے عود[1] جاں میں بھر دیا
نالہ جس نے راز کھولا عشق کا — حسرتِ گفتار کا ہے خونبہا!
آگ کی فطرت جو دے خاشاک کو — شوخیِ پروانہ بخشے خاک کو
مثلِ لالہ عشق کو کافی ہے داغ — ہے گلِ نالہ گریباں کا فراغ

[1] ایک ساز کا نام

میں یہ گل دیتا ہوں تیرے ساز کو
اک محشر تیرے خواب ناز کو

خاک تیری اس سے ہو گی لالہ زار
ہر نفس سے آئے گی بوئے بہار

تمہید

مفہومِ ربطِ فرد و ملّت

فرد ہے ربط جماعت سے نہال
ہے یہ رشتہ اس کے جوہر کا کمال

اپنی ملّت کا دل غمخوار رہ
رونق ہنگامۂ احرار رہ

قولِ پیغمبرؐ کو حرزِ جاں بنا
"بُعدِ ملّت سے ہے کام ابلیس کا"

فرد و قوم آئینہ ہیں باہمدگر
جیسے نجم و کہکشاں، سلک و گہر

فرد کا ملّت سے ہے سب احترام
فرد سے قائم ہے ملّت کا نظام

فرد خود کو قوم میں جب گم کرے
قطرۂ وسعت طلب قلزم بنے

خود ہی شکل سیرت دیرینہ ہے
ماضی و آئندہ کا آئینہ ہے

وصل ہے ماضی و استقبال کا
وقت ہے مثل ابد لا انتہا

قلب میں ذوق نمو ملّت سے ہے
احتسابِ رنگ و بو ملّت سے ہے

ربط جسم و جاں ہے اس کا قوم سے
ظاہر و پنہاں ہے اس کا قوم سے

گفتگو اس کی زبانِ قوم ہے
تابعِ اسلاف، جانِ قوم ہے

گرمیٔ صحبت سے ہو کر پختہ تر
فرد ہو جاتا ہے ملّت سربسر

پختگی وحدت کی گر کثرت میں ہے
کثرتِ آئینہ صفت وحدت میں ہے

لفظ جو نہی بیت سے باہر ہوا
گوہرِ مضمون شکستہ ہو گیا

برگِ تازہ گر کے اپنی شاخ سے
کیا امیدِ دیدِ فصلِ گل کرے

زمزمِ ملّت سے جو محروم ہے
نغمہ اس کے ساز کا معدوم ہے

فرد تنہا رہ کے ہے مقصد سے دور
اس کی قوت میں خلل ہوگا ضرور

قوم ہی ضبط آشنا اس کو بنائے
نرم رو مثلِ صبا اس کو بنائے

پا بہ گِل کر دے تو وہ شمشاد ہے
لاکھ زنجیروں میں بھی آزاد ہے

وہ اگر پابندیٔ آئیں کرے
آہوئے رم خو نہ کیوں مشکیں بنے

بیخودی کو تو خودی سمجھا کیا
آج تک وہم و گماں ہی میں رہا

جوہرِ نوری ہے تیری خاک میں
ہے کرن اس کی ترے ادراک میں

اس کے عیش و غم سے تیرا عیش و غم
زندگی تیری ہے اس کا ایک دم

وہ ہے واحد ناگوار اس کو دوئی
اس کی ضو سے میری تیری زندگی

خود ہے قائم، خود ہی بازی، خود ہی ساز
ناز پرورده ہے اس کا ہر نیاز

آگ کو کرتا ہے اس کا سوز تیز
ہے شرر اس کا سراسر شعلہ خیز

اس کی فطرت قید و آزادی کی شان
جزو میں اس کے ہے کل گیری کی جان

رزمِ پیہم سے اسے رہتا ہے کام
ہے خودی بھی زندگی بھی اس کا نام

گاہ پنہاں پردۂ خلوت میں ہے
اور کبھی ہنگامۂ جلوت میں ہے

اپنے دل میں نقش گیر "او" ہے وہ
یا کبھی "من" سے گزر کر "تو" ہے وہ

جبر جب لیتا ہے اس کا اختیار
عشق سے کرتا ہے اس کو پابہ دار

ناز جب تک ناز ہے یکسر ہے ناز
حد سے آگے ناز بنتا ہے نیاز

خود شکن ملّت میں ہوتی ہے خودی
برگِ گُل بنتا ہے جاں گلزار کی

ہیں یہی نکتے مثال تیغ تیز
ناسمجھ کو ھم سے لازم ہے گریز

ملّت اختلاطِ افراد سے بنتی اور اس کی تکمیلِ تربیت بنوّت سے ہوتی ہے

ربطِ مردم رشتہ باہم میں دیکھ
داستانِ رشتہ کو سرگم میں دیکھ

قوم میں ہے فرد بینی اپنا کام
کرتے ہیں گلشن سے گل چینی مدام

فطرۃً گم اپنی یکتائی میں ہے
گو تحفّظ محفل آرائی میں ہے

لوگ، فطرت کا تقاضا ہے، جلیں
رزمگاہِ زندگی کی آگ میں

خوگرِ اطوارِ یکجائی بنیں — مثلِ گوہر سلکِ گوہر میں ملیں

ہوں نبردِ زندگی میں یار سب — مثلِ ہمکاراں رہیں ہمکار سب

جذبِ باہم ہے ستاروں کی حیات — ہے بہم کوکب سے کوکب کو ثبات

کاروانی راہ ہیں دشت و جبل — ہے یہی قانونِ فطرت کا اٹل

سست و بیجاں تار و پود کالے ہے — ناشگفتہ غنچۂ پندار ہے

نغمۂ سازِ برق سے ناآشنا — تھا جو در پردہ نوا در پردہ رہا

جستجو کی سختیوں سے بے خبر — آرزو کی کاوشوں سے بے خبر

خالی خالی محفلِ نو زادہ کیا! — پنبہ[۱] جس کو جوش لے وہ بادہ کیا!

سبزۂ تازہ ہے افسردہ ابھی — خوں ہے اس کے تاک[۲] کا مردہ ابھی

قصۂ دیو و پری پر ہے مدار — ڈھونڈتا ہے اپنی ہستی سے فرار

ہستیِ ناپختہ ہے خلوت گزیں — فکر ہیں اس کی ابھی وسعت نہیں

وقفِ بیمِ جاں ہیں اس کے آب و گِل — بادِ صرصر سے لرز جاتا ہے دِل

---

۱ روئی کا ٹکڑا ۲ شاخِ انگور

سخت کوشی اس کی عادت ہیں نہیں
پنجہ زن دامانِ فطرت میں نہیں

جو زمیں اُگلے غنیمت ہے اسے
یا وہی اوپر سے جو خود آ گرے

تب کہیں آتا ہے صاحب دل کوئی
ایک دفتر جس کا ہو اک حرف بھی

نغمہ گر ایسا کہ اک آوازہ[1] سے
خاکِ (مردہ) کو حیاتِ تازہ دے

ذرۂ ناچیز کو بخشے ضیا
اور ہر پونجی کو کر دے بے بہا

اک نفس سے زندہ سو پیکر کرے
بزم کو سرخوش بیک ساغر کرے

چشم مارے، لب مسیحائی کرے۔!
یُوں دوئی سامانِ یکجائی کرے

ہے زمیں سے تا فلک اس کی کمند
پارہ پارہ زندگی کی حُلّہ بند

تازہ اندازِ نظر پیدا کرے
گلستاں تا دشت و در پیدا کرے

قوم اس کے سوز سے مثلِ سپند
جست اس کی شور زا، ہنگامہ بند

دل ہیں وہ جو نہی شرر افگن بنے
شعلۂ درگیر مٹی کو کرے

گِل کو اس کا نقشِ پا بینا کرے
ذرّے کو غیرتِ دہ سینا کرے

---

1 اصطلاح موسیقی میں ایسی نوا جو دو مقام سے ترکیب پائے ۱۲

عقلِ عریاں کو نیا پیرایہ دے ۔ یعنی اس بے مایہ کو سرمایہ دے

اس کے اخگر پر ہو جب دامن فشاں ۔ دور ہو کھوٹ اور زرِ خالص عیاں

جب غلاموں کو یہ کرتی ہے رہا ۔ ان کو آقاؤں سے کرتی ہے جدا

اُن سے کہتی ہے کہ تم بیدم نہیں ۔ اِن بتانِ بے زباں سے کم نہیں

رہنما ہوتی ہے سوئے مدعا ۔ کرتی ہے آئین کو زنجیرِ پا

کرتی ہے پھر وہ درِ توحید باز ۔ اس کو سکھلاتی ہے آئین نیاز

ملّتِ اسلامیہ کے ارکانِ اساسی

رکنِ اوّل

توحید

کچھ نہ پایا کیف وکم کی دبد سے ۔ عقل کو منزل ملی توحید سے

ورنہ اس واماندہ کی منزل کہاں
کشتی ادراک کا ساحل کہاں

رازِ توحید اہلِ حق پر ہے عیاں
ہے اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا[1] ابن نہاں

جو ترے اسرار تجھ پر وا کرے
امتحان ان کا عمل سے چاہیئے

دین و حکمت اور آئین اس سے ہے
زور و قوّت اور تمکین اس سے ہے

عالموں کو جلوۂ حیرت کا محل
عاشقوں کے حق میں پیغامِ عمل

اس کا سایہ پست کو بالا کرے
خاک کو اکسیر کی تاثیر دے

اس کی قدرت بندے کو اجلال دے
اور اسے نوعِ دگر میں ڈھال دے

تیز ہو جاتی ہے اس کی دوڑ دھوپ
خوں رگوں میں برف کا لیتا ہے روپ

مرگِ بیم و شک عمل کی ہے حیات
دیکھتی ہے آنکھ قلبِ کائنات

جب مقامِ عبدہٗ محکم ہوا
کاسۂ دریوزہ جامِ جم ہوا

ملّتِ بیضا ہے تن، جاں لَا اِلٰہ
ہے ہمارا ساز و ساماں لَا اِلٰہ

---

[1] آیۂ شریفہ۔ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں جو راز ہائے سربستہ ہیں وہ خدائے کریم نے اپنے بندے پر کھول دیے ہیں۔ (کوکب)

یہ ہمیں سرمایۂ اسرار ہے
اور یہی شیرازۂ افکار ہے

لب سے دل تک اس کا بُعد ہوتا ہے دور
زندگی کا زور بڑھ جاتا ہے اور

نقش اس کا سنگ کو کرتا ہے دل
دل ہو اغافل تو بن جاتا ہے گِل

ہم جو گزرے سوزِ غم کی راہ سے
خرمنِ امکاں جلایا آہ سے

آب دل ہے سینۂ انساں کا ساز
سوز اس آئینے کو کرتا ہے گداز

ہے اسی شعلے کی رگ رگ میں نمود
کچھ نہیں اس کے سوا اپنا وجود

ہے فقط توحید ہی کا یہ کمال
خویش ہیں فاروقؓ و بوذرؓ کے بلالؓ

دل ہے وجہِ خویشی و بیگانگی
شوق کی مستی ہے ہم پیمانگی

ہے دلوں کی یکرخی ملّت کا نور
ایک ہی جلوے سے روشن ہے بطور

قوم کی زد ایک ہونا چاہیے
مکر و مقصد ایک ہونا چاہیے

جذبۂ فطری ہو ایک، اظہار بھی
نیک و بد کا ایک ہو معیار بھی

ہو نہ جب تک سوزِ حق دمسازِ فکر
کس طرح ممکن ہے یہ اندازِ فکر؟

ہم مسلماں سب ہیں اولادِ خلیل
میرے دعوے کی اَبِیکُمْ ہے دلیل[1]

ہے وطن سے ربطِ تقدیرِ امم؟
ہے نسب بنیادِ تعمیرِ امم؟

اصلِ ملّت کی وطن میں جستجو
بادو آب و گِل کی پوجا کو بکو!

ہاں، نسب کی لن ترانی ہے فضول
افتخارِ جسمِ فانی ہے فضول

اپنی ملّت کی بنا ہے دوسری
اس بنا کی دل سے ہے وابستگی

ہم ہیں حاضر، دل ہے غائب کا اسیر
صیدِ این و آں نہیں اپنا ضمیر

اپنا رشتہ رشتۂ مستور ہے
ہے نظر لیکن نظر سے دور ہے

تیرِ خوش پیکانِ یک ملّت ہیں ہم
یک نما، یک بین و یک نیّت ہیں ہم

مدّعا اپنا مآل اپنا ہے ایک
طرز و اندازِ خیال اپنا ہے ایک

نعمتوں سے اس کی ہم اخواں[2] ہوئے
یک زبان و یک دل و یکجاں ہوئے

---

[1] آیۂ شریفہ۔ مِلَّۃَ اَبِیکُمْ اِبْرَاھِیمَ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] بھائی بھائی۔ مشہور حدیث کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ کی طرف اشارہ ہے۔

(کوکب)

یاس و حزن اور خوف ام الخبائث اور قاطع حیات ہیں ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ (صرف) توحید سے ہو سکتا ہے

موت کا ساماں ہے قطعِ آرزو | جاں کا استحکام ہے لَا تَقْنَطُوْ[1]
آرزو ہی زندگی کی لہر ہے | ناامیدی زندگی کو زہر ہے
یہ فشارِ قبر ہے تیرے لئے | تو جبل بھی ہو تو یہ ٹکڑے کرے
ناتوانوں سے ہے اس کا ربط و ضبط | نامرادی کو ہے اس سے خاص ربط
زندگانی کے لئے ہے موت یاس | زندگی آتی ہے کمزوروں کو راس؟
دیدۂ جاں کو بھی یہ اندھا کرے | روزِ روشن کو شبِ یلدا کرے
یہ قوائے زندگی کی موت ہے | چشمہ ہائے زندگی کی موت ہے
غم کے ماروں کا کفن ہوتی ہے یاس | نشترِ رگہائے تن ہوتی ہے یاس
اے کہ تجھ پر کثرتِ غم کا ہے دور | کر نبیؐ کے درسِ لَاتَحْزَنْ[2] پہ غور

---

[1] آیۂ شریفہ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ کی طرف اشارہ ہے۔
[2] آیۂ شریفہ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کی تلمیح ہے۔ (کوکب)

بوبکرؓ صدیق اس سے ہو گئے
سرخوش تحقیق اس سے ہو گئے

بندۂ حق کوکب زر بیز ہے
راہِ ہستی میں تبسم ریز ہے

بندۂ حق ہے تو غم سے ہو رہا
تو خیالِ بیش و کم سے ہو رہا

زورِ ایماں سے فزوں ہو گی حیات
کر تو لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ[1] ہی کی بات

جانبِ فرعون اگر جائے کلیم
دل ہے اس کا لَا تَخَفْ[2] سے مستقیم

خوفِ غیر اللہ عمل میں ٹوک ہے
کاروانِ زندگی کی روک ہے

عزم اس سے ممکنات اندیش ہے
ہمتِ عالی تامّل کیش ہے

تخم اگر یہ تیری مٹّی میں پڑا
زندگی کا روپ سے رشتہ گیا

اس کی فطرت ناتوانی کا شکار
دست و دل لرزاں اُسے ہیں سازگار

چور ہے یہ طاقتِ رفتار کا
ذہن کی جولانی افکار کا

گر عدو ڈرپوک تجھ کو دیکھ لے
شاخِ گل سے مثلِ گل توڑے تجھے

خوف اپنے پاؤں کی زنجیر ہے
اپنا دریا ورنہ عالمگیر ہے

---

[1] آیۂ شریفہ۔ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کی طرف اشارہ ہے [2] آیۂ قرآنی لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی کی تلمیح ہے۔ (کوکب)

باہمہ کوشش جو بے آہنگ ہے — زیم ہی سے نرم تارِ چنگ ہے

گوش تابی[1] سے اسے کر نغمہ خیز — نالے سے کردے فلک پر رستخیز

خوف کیا ہے؟ موت کا جاسوس ہے — تیرگی سے جس کا دل مانوس ہے

آنکھ اس کی برہمیِ کارِ زلیست — کان اس کے رہزنِ اخبارِ زلیست

تیرے دل میں جو بھی پوشیدہ ہے شر — خوف سے ہے، غور سے دیکھے اگر

چاپلوسی، مکر و کیں یا ہو دروغ — خوف ہی سے ان کو ملتا ہے فروغ

پردہ دارِ مکر اس کا پیرہن — اس کا دامن فتنہ پرور، پُر فتن

پختگی ہے اس کی ہمّت کا تضاد — اس لئے ناسازگاری سے ہے شاد

جو رموزِ مصطفےٰ پہچان لے — خوف میں ہے شرک مضمر جان لے

تیر کی شمشیر سے گفتگو

تیر نے جو کچھ کہا شمشیر سے — اس کو سنئے خود زبانِ تیر سے

---

[1] اصطلاح موسیقی میں تار کسنے کے لئے ساز کی کھونٹی مروڑنا ۔ کوکب

ہے صفت پریوں کی تیرے قاف میں
تیغ حیدرؓ ہے ترے اسلاف میں

دستِ خالدؓ کی حنا بندی ہے تو
شام پر بن کر شفق بکھری ہے تو

آتشِ قہرِ خدا! اے حفظِ دیں!
زیرِ سایہ ہے ترے خلدِ بریں

میں ہوا میں ہوں کہ ترکش میں نہاں
ہوں سراپا آتشِ شعلہ فشاں

سوئے سینہ جب میں جاتا ہوں مگر
اندرونِ سینہ جاتی ہے نظر

ہو نہ سینے میں اگر قلبِ سلیم
اور ہو بھی کچھ تو حزن و یاس و بیم

اس کو کر دیتا ہوں ٹکڑے بالیقیں
بخشتا ہوں خون کی نیم آستیں

ہاں اگر ہو قلبِ مومن جلوہ پاش
نورِ باطن پر ہو ظاہر کی معاش

پھر میں ہوتا ہوں گلِ نم کی طرح
نوک جھڑ جاتی ہے شبنم کی طرح

حکایتِ شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ

شاہِ عالمگیرؒ، وہ گردوں وقار
خاندانِ گورگاں کا اعتبار

مومنوں کا رُتبہ برتر اس سے ہے — عزتِ دینِ پیمبرؐ اس سے ہے
وہ میانِ کارزارِ کفر و دیں — اپنے ترکش کا خدنگِ آخریں
تخمِ مردہ اکبری الحاد کا — از سرِ نو طبعِ دارا میں اُگا[۱]
جا چکی تھی شمع دل کی روشنی — قوم اپنی فتنوں سے خالی نہ تھی
حق نے چُن کر شاہ عالمگیرؒ کو — اُس فقیر اور صاحبِ شمشیر کو
ہند میں احیائے دیں کے واسطے — کارِ تجدیدِ یقیں سونپا اُسے
توڑ دی اس نے کمر الحاد کی — بزم میں پھر شمعِ دیں روشن ہوئی
کور ذوقوں نے فسانے گھڑ لئے — وسعتِ ادراک سے واقف نہ تھے
شعلۂ توحید کا پروانہ تھا — وہ تھا ابراہیمؑ، یہ بتخانہ تھا
صف میں شاہوں کی ہے بےمثل آج بھی — قبر تک شاہد ہے اس کے فقر کی
ایک دن وہ زینتِ تاج و سریر — وہ سپہدار اور شہنشاہ و فقیر
سیر کرنے صبح جنگل میں گیا — اک غلامِ باوفا بھی ساتھ تھا

---

۱ دارا شکوہ کے الحادی افکار کی طرف اشارہ ہے ۱۲ (کوکب)

تھا ہوائے صبحگاہی میں سرور — ہر شجر پر چہچہاتے تھے طیور
تھا شہِ رمز آشنا محوِ نماز — تھی حقیقت کی طرف چشمِ مجاز
ناگہاں جنگل سے نکلا شیرِ ببر — اک قیامت تھی کہ آواز ہزبر[۱]
بوئے انساں سے ہوا جب باخبر — پنجہ مارا اس نے شہ کی پشت پر
شہ نے بے دیکھے ہی خنجر کھینچ کر — پارہ پارہ کر دیا اس کا جگر
خوف سے خالی رہا قلبِ دلیر — شیر قالیں ہو گیا جنگل کا شیر
تھا یہ بندہ بندۂ مقبولِ حق — مثلِ سابق ہو گیا مشغولِ حق
ایسا قلبِ خود نما و خود شکن — سینۂ مومن میں رکھتا ہے وطن
بندۂ حق پیش مولیٰ کچھ نہیں — سامنے باطل کے ہے حصنِ حصیں[۲]
تو بھی اے نادان ایسا دل بنا — اپنے شاہد کے لئے محمل بنا
خود کو کھو کر، کر خودی کی جستجو — بن نیاز آگیں و قلبِ ناز جو
عشق کو آتش زن اندیشہ کر — روبہ حق بن کے شیری پیشہ کر

---

[۱] ہزبر۔ شیر [۲] مضبوط قلعہ (کوکب)

خوفِ حق ایمان کا عنوان ہے — خوفِ دیگر شرک کی پہچان ہے

رکنِ دوم

رسالت

ہے خلیلی لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ[۱] — انبیا کے واسطے حق الیقین
وہ خدائے لم یزل کی روشنی — اس کے دل میں آرزوئے ملّت کی تھی[۲]
دیدۂ بیدار، وہ قلبِ ملول — وہ پیامِ طَہِّرَا بَیْتِیَ نہ بھول[۳]
دشتِ ویراں میں وہی ساکن ہوا — اس نے بیت اللہ کی ڈالی بنا
تُبْ عَلَیْنَا، نے کھلایا گلستاں — اس سے اپنا لہلایا گلستاں
پہلے حق نے صرف تن پیدا کیا — پھر رسالت سے اسے جاں کی عطا

---

۱ قرآنی الفاظ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قول کی تلمیح۔ ۱۲ (کوکب)

۲ آیۂ شریفہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ الخ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ (کوکب)

۳ آیۂ شریفہ وَعَهِدْنَا اِلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ الخ کی تلمیح ہے۔ ۱۲ (کوکب)

ہم کہ پہلے حرفِ بے آواز تھے ۔۔۔ اس طرح سے مصرعِ موزوں بنے

ہے رسالت اپنی تکوین کی بنا ۔۔۔ ہے رسالت دین و آئین کی بنا

بس رسالت ہی سے ہم واحد بنے ۔۔۔ جزو لاینفک ہیں سب ایک ایک کے

کہہ کے حق نے ہم سے یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ۔۔۔ حلقہ بندی کی رسالت سے مزید

حلقۂ ملّت محیط افزا ہوا ۔۔۔ اس کا مرکز وادیٔ بطحا ہوا

ہم اسی نسبت سے ملّت بن گئے ۔۔۔ دہر کو پیغامِ رحمت بن گئے

بحر سے ہوتے ہیں جب مائل بہ اوج ۔۔۔ رہتے ہیں مربوط ہم سب مثلِ موج

زیرِ دیوارِ حرم ہو کر دلیر ۔۔۔ گونجتے ہیں جس طرح جنگل میں شیر

بات یہ دل میں ترے اترے اگر ۔۔۔ ہو رسا صدیق اکبرؓ تک نظر

قوّتِ قلب و جگر ہوگا رسولؐ ۔۔۔ حق سے بھی محبوب تر ہوگا رسولؐ

اس کا قرآں زور و قوّت کی نوید ۔۔۔ اس کی حکمت ہے ہمیں حَبْلُ الْوَرِیْد

اس کا دامن چھوڑنا ہی موت ہے ۔۔۔ باد صرصر جیسے گل کی موت ہے

قوم اس کے دم سے صوت ریاب ہے
یہ سحر، وہ مہرِ عالمتاب ہے

فردِ حق سے، ملّت اس سے زندہ ہے
اس کے مہرِ فیض سے تابندہ ہے

بس اسی سے ہم نوا ہم ہو گئے
ہم نفس، ہم مدّعا ہم ہو گئے

باہمی کثرت میں ہے وحدت کی شکل
پختگی وحدت کی ہے ملّت کی شکل

زندہ وحدت سے ہے کثرت قوم کی
دینِ فطرت سے ہے وحدت قوم کی

دینِ فطرت کو نبیؐ سے سیکھ کر
ہم چراغِ راہ حق ہیں سربسر

اس گہر کا ہے وہی موّاج یم
ہم جو یکجاں ہیں اسی کا ہے کرم

جبتک اس وحدت کی ملّت ہے، امیں
اپنی ہستی بھی ابد کے ہے قریں

حق نے جب ہم پر شریعت ختم کی
شانِ وحدت پر رسالت ختم کی

ہم ہیں رونق محفلِ ایّام کی
حد رسالت کی وہ، ہم اقوام کی

ہم کو جب ساقی گری کا حق ملا
جام میں جو کچھ تھا وہ بھی مل گیا

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ حق کا ہے کرم
اس کرم کے مستحق ٹھہرے ہیں ہم

لہ مراد نبی کریمؐ۔

قوم کا سرمایۂ قوّت ہے یہ
حفظِ رازِ وحدتِ ملّت ہے یہ

حق نے ہر دعوے کو باطل کردیا
تا ابد اسلام کو دل کردیا

ردِّ غیر اللہ عمل مسلم کا ہے
نعرۂ لَا قَومَ بَعدِی اپنا ہے

بیان مقصودِ رسالتِ محمدیّہ جو تشکیل و تاسیسِ حرّیت اور مساوات و اخوّتِ بنی آدم کی بنیاد ہے

تھا جہاں میں آدمی انساں پرست
ناکس و نابود تھا اور زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر کا غلام
راہ میں اس کی بچھائے جس نے دام

کاہن و رہبان و سلطان و امیر
ایک تھا نخچیر لاکھوں صید گیر

پیر مذہب، اور اہلِ تخت و تاج
لیتے اس کی کشتِ ویراں سے خراج

ہر طرف اُسقف کلیسا کے تمام
حرص جنّت کے لئے پھرتے تھے دام

حدیث شریف مشہور۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ کوکب

برہمن گل چیں تھا اس کے باغ کا پھونک ڈالا مُغ بچوں نے جو بچا
اک امیں نے بن کے تب حق آشنا رتبۂ خاقان غلاموں کو دیا
سرفرازی اس نے مزدوروں کو دی اور اُن امیروں سے امارت چھین لی
کہنہ پیکر کھا گئے اس سے شکست نوعِ انساں کا ہوا پھر بندوبست
جسمِ انساں میں نئی جان آگئی زندگی ابھری خداوندی گئی
اس کی پیدائش قدامت کی تھی موت ہو گئے دیر و کلیسا سارے فوت
اس کے دل سے حریت پیدا ہوئی یہ مئے نوشیں ہے اس کے تاک کی
عصرِ نو جس سے جہاں آباد ہے یہ اسی انساں کا خانہ زاد ہے
زندگی کو اس نے نقش نو دیا پیش کر دی امتِ گیتی کشا
جو خیالِ ماسوا سے دور ہے اور حُبِ مصطفیٰؐ میں چور ہے
گرمیِ حق سے ہے امت سینہ تاب ذرّہ ہے شمعِ حریم آفتاب
شش جہات اس کیف سے رنگیں بنے چین کے بتخانے کعبے بن گئے

اس کے آباء میں ہیں کتنے انبیا　　پیشِ حق اکرم ہیں اس کے اتقیا[1]

کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ اس کے دل میں ہے　　حریت ہی اس کے آب و گل میں ہے

تھی خلافِ امتیازات اس کی ذات　　طرح اندازِ مساوات اس کی ذات

سرو کی صورت تھی آزاد اس کی آل　　پختہ تھی قَالُوْا بَلٰی سے خود مقال

حق کے سجدے گل بسیما ہو گئے　　مہر و مہ نے پاؤں پر بوسے دیئے

بو عبید اور جابان کی حکایت اخوت اسلامیہ کی روشنی میں

ہو گیا افواجِ ایراں کا امیر　　جنگ میں اک مردِ مسلم کا اسیر

گرگِ باراں دیدہ تھا، عیّار تھا　　حیلہ جو تھا، پُر فن و مکّار تھا

کیا بتاتا مرتبہ اپنا بھلا　　نام بھی جب اس نے پوشیدہ رکھا

---

[1] آیۂ شریفہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

مردِ مسلم سے مگر چاہی اماں
اس کے ایماں کو بھی لایا درمیاں

سن کے یہ بولا وہ مردِ نیک نام
"خوں بہانا تیرا مجھ پر ہے حرام"

جب درفشِ کاویانی[1] گر چکا
کوکبِ اولادِ ساساں پھر چکا

تب ہوا معلوم وہ جاباں ہے
خود امیرِ لشکرِ ایران ہے

دی خبر اس کی سپہ سالار کو
قتل کرنے پر تُلے مکّار کو

بو عبیدہ[2] سیّدِ فوجِ حجاز
جنگ میں بھی فوج سے تھے بے نیاز

"ہم مسلماں ہیں" کہا "اے دوستو!
تم بھی سب اک ساز ہی کے تار ہو

صوتِ حیدرؓ ہے نوائے بوذری
ایک ہیں حلقِ بلالؓ و قنبری

ہم میں جو بھی ہے امینِ قوم ہے
صلح و کیں بھی صلح و کینِ قوم ہے

قوم ہوتی ہے اساسِ جانِ فرد
قوم کا پیمان ہے پیمانِ فرد

گرچہ جاباں ہے ہمارا انیشِ جاں
ایک مسلم نے اسے دی ہے اماں

یاد رکھ اے امّتِ خیر الانام!
ہے مسلمانوں پہ خوں اس کا حرام"

---

[1] ایرانی علم [2] حضرت ابو عبیدہ ابن جرّاح سپہ سالار لشکرِ اسلام۔ (کوکبؔ)

سلطان مراد اور معمار کی حکایت مساواتِ اسلامیہ کی روشنی میں

ایک معمار خجندی تھا کبھی
دور تک شہرت تھی اس کے نام کی
جب ملا فرمان سلطانِ مراد
مسجد اک تعمیر کی عالی نہاد
وہ مگر آئی نہ سلطاں کو پسند
ناسزا ٹھہرا وہ معمار خجند
ہوگیا سلطان اتنا خشمگیں
کاٹ ڈالا ہاتھ خنجر سے وہیں
پیش قاضی مرد بیچارہ گیا
راہ میں پہنچے سے خوں بہتا رہا
جا کے قاضی سے کہی سب داستاں
اور دکھایا اپنا دستِ خونچکاں
"ہے پیامِ حق" کہا "تیرا کلام
حفظِ آئینِ محمدؐ تیرا کام
سطوتِ سلطاں سے مجھ کو مت ڈرا
کر مرا از روئے قرآں فیصلہ"
پہلے قاضی نے چبائے اپنے لب
پھر کیا سلطان کو اس نے طلب

ہیبتِ قرآں سے سلطاں کانپتا ‏ مثلِ مجرم سامنے حاضر ہوا
شرم کے مارے نگاہیں تھیں جھکی ‏ سرخ تھے سلطان کے رخسار بھی
تھا اُدھر فریادیِ دعوےٰ گزار ‏ اِس طرف شاہنشہِ گردوں وقار
عرض کی سلطان نے "اے عالی وقار! ‏ ہوں خطا پر اپنی بے حد شرمسار"
بولے قاضی "ہے قصاص اصلِ حیات[1] ‏ زندگی کو ہے اس آئیں سے ثبات
عبدِ مسلم کم ہے کیا احرار سے؟ ‏ شہ کا خوں بہتر ہے کیا معمار سے؟
شاہ نے سنتے ہی ان کلمات کو ‏ آستیں الٹی بڑھایا ہات کو
مدعی یہ دیکھ کر آگے بڑھا ‏ آیۂ بِالعَدلِ وَالاِحسان[2] پڑھا
پھر کہا "بہرِ خدا بخشا اسے ‏ میں نے بہرِ مصطفیٰؐ بخشا اسے"
اس مقامِ شاہ و صنعت گر کو دیکھ ‏ سطوتِ آئینِ پیغمبر کو دیکھ
پیشِ قرآں بندہ و مولیٰ ہیں ایک ‏ بوریا اور مسندِ دیبا ہیں ایک

---

[1] آیۂ شریفہ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَاب کی طرف اشارہ ہے۔ [2] آیۂ شریفہ اِنَّ اللہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَان کی تلمیح ہے۔ (کوکب)

بیانِ حریّتِ اسلامیہ وسرِّ حادثۂ کربلا

جو ہے وابستہ ہُوَ الْمَوجُوْد سے
ہے وہی آزاد ہر معبود سے

عشق ہے مومن سے، مومن عشق سے
امرِ ناممکن ہے ممکن عشق سے

عقل ہے سفاک، وہ سفّاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

عقل ہے پابندِ اسباب وعلل
عشق ہے جانبازِ میدانِ عمل

عشق کرتا ہے بزورِ دست رام
عقل مکّاری کا پھیلاتی ہے دام

بیم وشک ہیں عقل و دانش کا مزاج
عشق ہے عزم ویقیں کا امتزاج

اس کی تعمیروں میں ویرانی نہاں
اس کے ویرانے سے آبادی عیاں

عقل ارزاں مثل باد وآب ہے
بے بہا ہے عشق اور کمیاب ہے

عقل کا مرکز اساس چون وچند
عشق عریاں بے لباس چون وچند

عقل کہتی ہے کہ آگے آئیے
عشق کا قول، امتحاں فرمائیے

عقل کا علمی ذریعہ اکتساب
عشق فضلِ رب سے ہے اپنا حساب

عقل کا فرمان ہے آبادی، خوشی
عشق کا آئین ہے آزادگی

حریت ہے عشق کا آرام جاں
اس کے ناقے کی یہی ہے سارباں

عشق نے اک روز وقتِ کارزار
کر دیا عقلِ ہوس پیشہ کو خوار

وہ امام عاشقاں، ابن بتولؓ
سروِ آزاد گلستانِ رسولؐ

بائے بسم اللہ شہادت کی پدر
معنی ذِبحِ عظیم[1] اس کا پسر

نھا پئے شہزادہ خیر الملل
دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل[2]

سرخ رو ہے عشق اسکے خون سے
زندہ ہے یہ قول اسی مضمون سے

امت مسلم کی ہے وہ جان میں
قُل ھُوَ اللہ جیسے ہے قرآن میں

موسیٰ و فرعون، شبیرؑ و یزید
قوتیں یہ کب رہی ہیں ناپدید[3]

قوتِ شبیرؑ ہے حق کا چراغ
قسمتِ باطل ہے محرومی کا داغ

---

[1] آیۂ شریفہ وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی طرف اشارہ ہے [2] حدیث قدسی نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُکُمَا وَنِعْمَ الْعِدْلَانِ اَنْتُمَا کی طرف اشارہ ہے [3] ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
(سموکتب) چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی (اقبال)

جب خلافت ہو گئی قرآں سے دور
حریّت میں ہو گیا پیدا فتور

تب اٹھا وہ سرورِ خیر الامم
لے کے مثلِ ابرِ باراں در قدم

کربلا پر جا کے برسا، کھُل گیا
کتنے ویرانوں کو دے کر گُل گیا

فکر ہائے جورِ مستقبل گئے
خون سے اس کے گلستاں کھل گئے

خاک و خوں میں لوٹ کر وہ حق پناہ
بن گیا آخر بنائے لاَ اِلٰہ[1]

سلطنت ہوتی اگر پیشِ نظر
بے سر و ساماں نہ کرتا یوں سفر

اُس طرف اعدائے دیں تھے بیشمار
اس طرف خالی بہتّر دوستدار

سرِّ ابراہیم و اسمٰعیل تھا
یعنی اُس اجمال کی تفصیل تھا

اس کا عزم پختہ مثلِ کوہسار
تھا نہایت پائدار اور کامگار

تیغ ہے بس عزّتِ دیں کے لئے
گر اٹھے تو حفظِ آئیں کے لئے

کوئی مسلم غیر کا بندہ نہیں
ماسوا کے سامنے جھکتا نہیں

اس کے خوں نے راز یہ اِفشا کیا
ملّتِ مردہ کو زندہ کر دیا

---

[1] حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؓ۔

تیغِ "لا" کو اس نے جب عریاں کیا
خوں رگِ ارباب باطل سے بہا

نقشِ اِلَّا اللہ صحرا پر لکھا
بخششِ امّت کا ساماں کر دیا

رمزِ قرآنی ہمیں سمجھا گیا
رازِ ایمانی ہمیں سمجھا گیا

وہ فروغِ شام و بغداد اب کہاں
مٹ گیا غرناطہ کے فر کا نشاں

ہم ہیں زندہ قوّتِ شبیرؓ سے
تازہ ہے ایماں اسی تکبیر سے

آنکھ سے نکلے تو اشکِ چشمِ تر
کاش پہنچے اس کی خاکِ پاک پر

چونکہ ملّتِ محمّدیہ کی بنیاد توحید و رسالت پر ہے اس لئے حدود مکانی سے بے نیاز ہے

اپنا جوہر کیوں ہو پابند مقام
اس کی صہبا کا نہیں جب کوئی جام

ہندی و چینی سفال جام ہے
رومی و شامی گلِ اندام ہے

اپنے دل کو ہند و روم و شام کیا
مرز و بوم اپنی بجز اسلام کیا

پیشِ پیغمبرؐ جو کعبؓ خوش نہاد — لے کے آئے ہدیۂ بانَتْ سُعاد[1]

وصفِ پیغمبرؐ میں جب کھولی زبان — سیفِ ہندی بھی بتائی اُنکی شان

آسماں سے جن کا رتبہ تھا بلند — ان کو یہ نسبت کہاں آتی پسند

ٹوک کر بولے نہ یہ فقرہ کہو — مجھ کو سَیفٌ مِنْ سُیُوفُ اللہ کہو

تھے پیمبرؐ رازدانِ جزو کل — خاکِ پا تھی سرمۂ چشمِ رُسُل

چھوڑ کر امّت کی دنیا میں جو تھا — طاعت و طیب و نسا کو لے لیا

ڈالئے امّت کی دنیا پر نظر — منکشف ہوگا یہ رمزِ مستتر

رہ کے دنیا میں سراپا تھا الگ — آپ کا مقصودِ دنیا تھا الگ

حضرتِ آدمؑ جب آب و گل میں تھے — آپ تب بھی نور کی محفل میں تھے[2]

مرز و بوم اس کی مجھے معلوم کیا — یہ خبر ہے، تھا ہمارا آشنا

یہ عناصر کب بنے اس کا جہاں؟ — وہ جہاں میں تھا ہمارا میہماں

ہم عناصر کے جہاں میں گم ہوئے — سب کے سب اس خاکداں میں گم ہوئے

---

[1] مدحِ رسولؐ میں حضرت کعبؓ کے قصیدہ کا عنوان ۱۲ [2] حدیث قدسی کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

تو مسلماں ہے تو بن عالم پسند چھوڑ دے راہِ جہانِ چون و چند
مقصدِ مسلم نہیں ہے مرز و بوم ہے فضول اس کو خیالِ شام و ردم
ہے اگر دنیا تو ہے دنیائے دل اس میں گم ہے یہ سرائے آب و گل
قومیت مسلم کی ہوتی ہی نہیں ہے یہ رمزِ ہجرت آقائے دیں
اس کی حکمت کو کوئی دیکھے ذرا ایک کلمے پر ہے ملّت کی بنا
ہے یہی تو بخششِ سلطان دیںؐ اپنی مسجد ہے یہ سب روئے زمیں
جس کا قرآں میں خدا ہے مدح خواں کر لیا تھا جس سے عہد حفظِ جاں[1]
اس کی ہیبت سے عدو مجبور تھے لرزہ براندام تھے معذور تھے
پھر وطن سے کس لئے باہر گیا؟ بھاگ نکلا؛ دشمنوں سے ڈر گیا؟
دشمنوں نے قصّے پر قصہ گھڑا معنیٔ ہجرت کوئی سمجھا نہ تھا
ہے یہی مسلم کا آئین حیات ہیں نہاں ہجرت میں اسباب ثبات
اس کا مطلب ہے، تنک آبی سے رم ترکِ شبنم ہے رہِ تسخیرِ یم

---

[1] آیۂ شریفہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲۰ (کوکب)

ترک گل سے گلستاں مقصود ہے
وہ زیاں پیرایہ بندِ سود ہے

ہے جہاں گردی میں سورج کا بھرم
عرصۂ آفاق ہے زیرِ قدم

ہے ندی کی طرح کیوں باراں طلب
بے کراں بن جا، نہ بن پایاں طلب

یہ سمندر ایک دشتِ سادہ تھا
لے کے ساحل پانی پانی بن گیا

دل میں رکھ تو قصد تسخیرِ تمام
تاکہ ہو جائے فراگیرِ تمام

مثلِ ماہی بحر میں آباد ہو
ساحلوں کی قید سے آزاد ہو

ترک گل سے بوئے گل آزاد ہے
یہ حدودِ باغ میں ناشاد ہے

تو چمن میں پڑ گیا ہے ایک جا
مثل بلبل ایک گل کا ہو رہا

پھینک دے مثل صبا بارِ قبول
گرم سیری کو بنا اپنا اصول

عصرِ نو کی چال سے ہشیار رہ
اس رہ بد فال سے ہشیار رہ

وطن اساسِ ملت نہیں ہے

اس طرح قطعِ اخوّت؟ مرحبا!
ملک پر بنیادِ ملّت؟ مرحبا!

خلد سمجھے جس کو تھا بِئسَ القرار — پڑھو اَحَلُّو قَومَهُم دَارَ البَوار [1]

لو وطن کو شمع محفل کر دیا — نوعِ انساں کو قبائل کر دیا

اس نے دنیا کو جہنم کر دیا! — جذبۂ پیکار بار آور ہوا

مردمی دنیا میں افسانہ ہوئی — آدمی ہے آدمی سے اجنبی

نوعِ انسانی کی یوں جڑ کٹ گئی — آدمیت قومیت میں بٹ گئی

مسندِ مذہب سیاست کو ملی — یہ کلی بستانِ مغرب میں کھلی

قصۂ دینِ مسیحا اب کہاں — شعلۂ شمعِ کلیسا اب کہاں

اب کہاں باقی وہ زورِ اُسقُفی — استخواں ہے روح مذہب اڑ گئی

قوم نے اوجِ کلیسا کھو دیا — نقدِ آئینِ چلیپا کھو دیا

دہریت مذہب کو سمجھی جب فضول — حضرتِ شیطاں سے آیا اک رسول

اللہ اللہ اجرآنِ میکاولی [2] — چشمِ انساں سے بصیرت چھین لی

۱؎ آیۂ شریفہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ یَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ کی طرف اشارہ ہے۔ ۲؎ کتاب الملوک کا مصنف میکاولی۔ فلارنس میں پیدا ہونے کی بنا پر اقبال نے اسے فلارنساوی کہا ہے۔ (کوکب)

بادشاہوں کے لئے لکھ کر کتاب
اس نے کھولا باہمی جنگوں کا باب

اس نے تاریکی سے رشتہ جوڑ کر
رکھ دیا پیمان حق کو توڑ کر

بت تراشے اس نے آذر کی طرح
نقش باندھے قلب بتگر کی طرح

کس قدر بے دین تھا باطل نگار
مملکت کو کہہ گیا پروردگار

تھا اسے تکیہ اسی معبود پر
نقد حق پرکھا عیار سود پر

نقشِ باطل رنگ و روغن بن گیا
مکر اس تعلیم سے فن بن گیا

اس نے تدبیر زبوں فرجام سے
جادۂ ہستی میں کانٹے بھر دیئے

کہہ کے فن بگڑی ہوئی تصویر کو
مصلحت بتلا گیا تزویر کو

ملّت محمدّیہ بربنائے وعدہ ودوام حدود زمانی سے بھی آزاد ہے

فصلِ گل میں جوش بلبل دیکھئے
رستخیزِ غنچہ و گل دیکھئے

ہیں یہ کلیاں یا عروسانِ حسیں
بن گیا گلشن ستاروں کی زمیں

آبِ جُو نے دیں جو اس کو لوریاں
اوس کھا کر ہو گیا سبزہ جواں

شاخ پر جو غنچۂ تازہ کھلا
گو دہیں بادِ سحر نے لے لیا

دستِ گلچیں سے جو غنچہ خوں ہوا
مثلِ بو گلشن سے باہر چل دیا

آئی قمری اور بلبل اُڑ گئی
آمدِ شبنم سے خوشبو چل بسی

لاکھ جائیں لالۂ ناپائدار
کم نہ ہوگی رونقِ فصلِ بہار

ہو زیاں، گنجِ فراواں ہے وہی
محفل میں گلہائے خنداں ہے وہی

فصلِ گل ہے سن سے پختہ تر
غنچہ و سروِ سخن سے پختہ تر

کوئی گوہر ٹوٹ بھی جائے اگر
کانِ گوہر پر نہیں پڑتا اثر

مشرق و مغرب کی لاکھوں صبح و شام
ہو گئیں غائب دکھا کر اپنا کام

ہم گئے تو میکدے کا کیا گیا
دورِ ماضی جا کے بھی فردا رہا

جبکہ ہے پائندہ تقویمِ امم
کیا ہوا جو ہو گئے افراد کم

ہے سفر میں اس کی صحبت دائمی
ہے مسافر فرد، ملّت دائمی

ذات سے ہیں مختلف اسکے صفات
اور رہی ہے سنّتِ موت و حیات

فرد کی تکوین آب و گل سے ہے
قوم کی تخلیق صاحبدل سے ہے

فرد کے دن ساٹھ ستّر سال بس
قوم کے سو سال سمجھو اک نفس

فرد کی ہستی ہے ربطِ جان و تن
قوم کی جاں حفظِ ناموس کہن

موت اس کی خشکیِ رودِ حیات
موت اِس کی ترکِ مقصودِ حیات

فرد کی تخصیص ہے ملّت کی موت
جب اجل آتی ہے ہوجاتی ہے فوت[1]

امّتِ مسلم ہے فرمانِ خدا
سر بسر ہنگامہ قالوا بلیٰ

موت سے کیوں پھر یہ بے پروا نہ ہو
حق کا فرمان نَحْنُ نَزَّلْنَا سنو[2]

ہے قیام ذکر ذاکر کا قیام
ذکر کو حاصل ہے ذاکر سے دوام

اس کو ہے اَنْ یُّطْفِئُوا وجہِ فراغ[3]
بجھ نہیں سکتا کسی سے یہ چراغ

---

[1] آیۂ شریفہ وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ کی طرف اشارہ ہے ۱۲، [2] آیۂ شریفہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی طرف اشارہ ہے ۱۲، [3] آیۂ شریفہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

حق پرستی میں اگر کامل ہو قوم
کیوں نہ پھر محبوبِ صاحبدل ہو قوم

حق نے عریاں کی وہی تیغ اصیل
تھی جو در پردہ تمنّائے خلیل

صدق ہو زندہ اگر شمشیر سے
غیرِ حق جل جائے گا تاثیر سے

ہم اگر توحید حق کی ہیں دلیل
فہم رمزِ دیں میں بھی ہیں بے عدیل

چرخ ہم سے برسرِ پیکار تھا
ساتھ اس کے فتنۂ تاتار تھا

اس نے شہ دی اور جورِ فتنہ کو
آزمایا ہم پہ دورِ فتنہ کو

اُف! وہ فتنہ، فتنۂ محشر پناہ
یہ کہو محشر بھی تھا پامالِ راہ

فتنہ کیا، آشوب ہی آشوب تھا
آج تک ایسا نہ پھر برپا ہوا

خاک میں توقیرِ مسلم مل گئی
یہ قیامت روم پر ٹوٹی نہ تھی

پوچھ لیکن چرخ کج رفتار سے
اس نو آئین کہن پندار سے

آتش تاتار تھی کس کا چمن؟
اس کے شعلے سے ہوئی کس کی پھبن؟

ہم کو فطرت ہی براہیمی ملی
حق سے نسبت بھی براہیمی ملی

ہم بجھا دیں آگ ہر نمرود کی
گل بنا دیں آگ ہر نمرود کی

شعلہ ہائے انقلابِ روزگار
اپنے پاس آئیں تو بن جائیں بہار

روم کی اب گرم بازاری کہاں
وہ جہانگیری جہانداری کہاں

خوں میں ڈوبا شیشۂ ساسانیاں
مٹ گیا خمخانۂ یونانیاں

مصریوں کا ہو چکا ہے امتحاں
ہیں نہ اہرام ان کی ہڈیاں

دہر میں بانگِ اذاں تھی، اور ہے
ملّتِ اسلامیاں تھی، اور ہے

عشق عالم کا ہے آئینِ حیات
عشق سے ہے امتزاجِ سالماتؔ[1]

ہے ہمارے سوزِ دل سے زندہ عشق
لا الٰہ کے نور سے تابندہ عشق

گو مثالِ غنچہ ہم دلگیر ہیں
گلستانِ دہر کی تقدیر ہیں

نظامِ ملّت آئین کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا ملّتِ محمّدیہ کا آئین قرآن ہے

ہاتھ سے ملّت کے جب آئیں گیا
منتشر سمجھو کہ شیرازہ ہوا

[1] عناصر کے اجزائے ترکیبی ۱۲

ہر مسلماں کی یہی ہے زندگی — باطن دینِ نبیؐ ہے بس یہی

نسبت آئیں سے پتہ گُل بنا — گُل اسی نسبت سے گلدستہ ہوا

نغمہ اک ضبطِ صدا کا نام ہے — تارِ بے ضبطِ صدا ناکام ہے

ہے گلے میں سانس اک موجِ ہوا — بنتی ہے پابند نے ہو کر نوا

کچھ خبر ہے، ہے ترا آئین کیا؟ — جو زمیں پر رازِ تمکیں ہے ترا

وہ کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمت اس کی لایزل ہے اور قدیم

وہ کتابِ زندہ، تکوینِ حیات — جس کے دم سے بے ثباتی ہے ثبات

شک نہیں ہے اس میں[1] تبدیلی نہیں[2] — کوئی آیت اس کی تاویلی نہیں

پختہ ہوتا ہے اسی سے عزمِ خام — اس کے بل پر سنگ سے بھرتا ہے جام

دل یہ دے پابند کو آزاد کا — قیدیوں کو حوصلہ فریاد کا

نوعِ انساں کو پیامِ آخریں — حامل کا اس کا رحمۃ للعالمیں

خاکساروں کو کرے یہ ارجمند — بندے کو سجدے سے کر دے سربلند

---

[1] لَا رَیْبَ فِیْہِ (آیہ شریفہ) [2] لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللہ (آیہ شریفہ)

رہزن، اس کے حفظ سے رہبر بنے　　حرف لے کر صاحبِ دفتر بنے
دشت پیما اس دیئے کے نور سے　　صاحبِ علم لدنّی بن گئے
کوہ کو جس کا نہ تحمّل تھا محال　　آسماں کو بھی نہ تھی جس کی مجال[1]
وہ ہمارے دل کے گنجینوں میں ہے!　　قوم کے اطفال کے سینوں میں ہے!!
اُف! وہ بدوی، ریگ صحرا کا جلال　　دھوپ کی تابش سے آنکھیں لال لال
نخل کے نیچے ابھی سویا ہوا　　اٹھ گیا سن کر ابھی بانگِ درا
دشت پیما، بام و در سے بے خبر　　ہرزہ رو، کیفِ خضر سے بے خبر
اک تڑپ قرآن سے دل میں اٹھی　　موجِ بے تاب اُس کی آسودہ ہوئی
درس آیاتِ مبیں سے جب لیا　　آ کے بندہ پیشِ حق آقا بنا!
پھر جہانبانی نوائے ساز تھی　　مسندِ جم فرش پا انداز تھی
شہر اس کی گردِ پا سے بس گئے　　ایک گل سے سیکڑوں گلشن بنے
تیرا ایماں رسم بن کر رہ گیا　　شیوہ ہائے کافری میں بہہ گیا

---

[1] آیہ شریفہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الخ کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

کر دیا تو نے حکومت کو زبر[1] ۔۔۔ رہ گئی منزل تری ہو کر نکر[2]

چاہے گر مثلِ مسلماں زندگی ۔۔۔ کچھ نہیں ہے جز بہ قرآں زندگی

شاد ہے صوفی فضائے حال پر ۔۔۔ جھومتا ہے نغمۂ قوّال پر

مُرتکز شعرِ عراقی[3] پر ہے فکر ۔۔۔ بزم میں اس کی نہیں قرآں کا ذکر

اب کلاہ و بوریا ہیں تخت و تاج ۔۔۔ لے رہے ہیں خانقاہوں سے خراج

اپنے واعظ قصّہ گو، افسانہ بند ۔۔۔ ان کے معنی پست تقریریں بلند

ہیں خطیب و دیلمی[4] کے خوشہ چیں ۔۔۔ شاذ و مرسل[5] کچھ حدیثیں جزو دیں

فرض ہے تجھ پر کہ خود قرآں پڑھے ۔۔۔ اور ہر مشکل میں اس سے کام لے

زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے

عہدِ حاضر ہے بہ الفاظِ دگر ۔۔۔ فتنہ پرور، فتنہ گر، فتنہ بسر

---

[1] فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (آیہ شریفہ) [2] يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۔ آیہ شریفہ [3] ایک فارسی شاعر کا تخلص [4] محدثین کے نام [5] ضعیف احادیث کی اقسام (کوکب)

اس نے کاٹی شاخسارِ زندگی
بزمِ اقوامِ کہن برہم ہوئی

اس نے ہم کو خود سے بیگانہ کیا
کر دیا ہے سازِ اپنا بے نوا

آتشِ دیرینہ دل سے چھین لی
نور و نارِ لا الٰہ کی دھن گئی

مضمحل ہو جائے جب نظمِ حیات
قوم کو تقلید دیتی ہے ثبات

ہے رہِ اسلاف جمعیّت تری
مسلکِ تقلید ہے طاقت تری

اے خزاں میں بے نصیبِ برگ و بار!
کب نمودِ گُل ہے ترکِ شاخسار؟

بحر کھویا، اب زیاں اندیش بن
جوئے کم مایہ! حفاظت کیش بن

دے تجھے سیلاب شاید برتری
پھر تری قسمت ہو طوفان پروری

دیدۂ دل میں بصارت ہے اگر
کر نظر احوالِ اسرائیل پر

دیکھ اس کے گرم و سردِ حال کو
سختیِ جاں کو، دلِ پامال کو

خوں رگوں میں اب نہیں ہے جست خیز
ہے جبیں ہر سنگِ در پر سجدہ ریز

تاکِ جاں ہر چند افسردہ سہی
ہے نشانِ موسیٰ و ہاروں ابھی

ہے نوائے آتشیں محروم سوز ‏ ‏ ‏ ‏ دم مگر سینے میں باقی ہے ہنوز
قوم میں ہر چند جمعیّت نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ سنّت آبا ہے دل میں جاگزیں
بزم دیرینہ تری برہم ہوئی ‏ ‏ ‏ ‏ کب سے ہے خاموش شمع زندگی
نقش دل پر معنیِ توحید کر ‏ ‏ ‏ ‏ غم نہ کر، اسلاف کی تقلید کر
اجتہاد اپنا بہ دورِ انحطاط ‏ ‏ ‏ ‏ خود الٹ دیتا ہے ملّت کی بساط
اجتہاد خام سے ہے سربسر ‏ ‏ ‏ ‏ اقتدائے رفتگاں محفوظ تر
عقل ان کی حرص فرسودہ نہ تھی ‏ ‏ ‏ ‏ مقصدِ ذاتی سے آلودہ نہ تھی
تھی نگاہ رفتگاں باریک بیں ‏ ‏ ‏ ‏ زہد تھا زہد رسالت کے قریں
اب وہ شانِ ملّتِ تازی کہاں! ‏ ‏ ‏ ‏ ذوقِ جعفر[1] کاوشِ رازی[2] کہاں
تنگ ہم پر رہگذار دیں ہوئی ‏ ‏ ‏ ‏ سطح بینی عینِ آگاہی ہوئی
راز ہائے دیں سے تو بیگانہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ لے وہی آئین اگر فرزانہ ہے
کہہ گیا ہم سے یہ نبّاضِ حیات ‏ ‏ ‏ ‏ اختلاف اپنا ہے مقراضِ حیات

---

[1] سلطنت عباسیہ کا مشہور وزیر جعفر برمکی [2] امام فخر الدین رازی صاحب تفسیرِ کبیر۔ (کوکب)

ہے یک آئینی مسلماں کی حیات
پیکرِ ملّت ہے قرآنی ثبات

صرف قرآں ہی دلِ آگاہ ہے
جمع ہو اس پر کہ حبل اللہ ہے[1]

سلکِ قرآنی میں رہ مثلِ گہر
منتشر ورنہ رہے گا عمر بھر

سیرتِ ملّی کی پختگی آئینِ الٰہیہ کے اتباع سے ہے

سُن کہ ذو معنی نہیں ہے شرعِ دیں
جز ضیا کچھ اور گوہر میں نہیں

اس گہر کا خود ہے گوہر گر خدا
ظاہر و باطن ہے اس کا ایک سا

علمِ حق کیا ہے شریعت کے سوا؟
اصلِ سنّت کیا محبّت کے سوا؟

شرع کیا ہے؟ اصلِ دیں کا آئینہ
سب مقاماتِ یقیں کا آئینہ

حق کے آئیں سے ہے ملّت میں نظام
نظمِ محکم ہے مگر شرطِ دوام

شرع سے ہوتی ہے علمی راہ طے
یہ عصا ہے اور یدِ بیضا بھی ہے

شرع میں مضمر ہے اصلِ اسلام کی
ہے یہی آغاز بھی انجام بھی

---

[1] آیۂ شریفہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کی طرف اشارہ ہے (کوکب)

تارہے تو حکمت دیں کا امیں — مجھ سے سن لے نکتۂ شرع مبیں
ہو اگر کوئی مزاحم بے سبب — فرض منوائے ادائے مستحب
یہ نہ ہو تو فرض اس کو مان لے — زندگی کو عین قدرت جان لے
جنگ کے میدان میں دشمن اگر — صلح کو سمجھے مآل بے خطر
شوق سے کرنے لگے پھر کاروبار — توڑ ڈالے اپنے سب حصن و حصار
پختہ ہو اس کا نہ پھر جب تک نظام — تاخت اس کے ملک پر سمجھو حرام
جان اس فرمانِ حق کے راز کو — زندگی خطرات سے خالی نہ ہو
شرع کا ہے یہ تقاضا وقتِ جنگ — شعلہ بن کر چیر دے تو حلقِ سنگ
جنگ ہے قوت کا تیری امتحاں — راہ میں لاتی ہے لاکھوں سختیاں
سختیوں سے پھر یہ کہتی ہے گزر — سینۂ الوند[1] رکھ دے چیر کر
ہوتی ہے کب کوئی میشِ ناتواں — لائقِ سرپنجۂ شیر ژیاں
خوش اگر ہو کر ممولے سے لڑا — صید سے سمجھو، زبوں تر ہو گیا

---

[1] ایران کے ایک پہاڑ کا نام۔

شارعِ رازِ آشنائے دہر نے
نسخۂ قدرت لکھا تیرے لئے

آہن اعصابی عمل سے دی تجھے
جو دیئے تجھ کو مقام اچھے دیئے

کر دیا خستہ دلوں کو استوار
پختگی بخشی مثالِ کوہسار

ہے جو دینِ مصطفےٰ دینِ حیات
شرع ہے تفسیرِ آئینِ حیات

یہ زمیں سے آسماں کر دے تجھے
سرِّ حق کا راز داں کر دے تجھے

شرع سے آئینہ بن جاتا ہے، سنگ
یہ اُڑاتی ہے دل آہن سے زنگ

جب سے کھویا ہے شعارِ مصطفےٰ
قوم نے رازِ بقا بھی کھو دیا

وہ نہال استوار و سربلند
مسلمِ صحرا، سبک سیری پسند

جب سکونت وادیٔ بطحا میں تھی
تربیت بھی گرمیٔ صحرا نے دی

مثلِ نے بادِ عجم نے کر دیا
اس ہوا سے سوکھ کر کانٹا ہوا

شیر کو جو جانتا تھا گوسفند
چیونٹی کے سامنے ہے دردمند

جس کا نعرہ کرتا تھا پتھر کو آب
صوتِ بلبل سے اسے ہے اضطراب

کوہ کو بھی جو کبھی کہتا تھا کاہ — کر رہا ہے اب توکّل سے نباہ
توڑتا تھا جو کبھی اعدا کا سر — ہے اسے سینے کی دھڑکن سے خطر
تھے کبھی جس کے قدم ہنگامہ خیز — اب فقط عزلت گزینی میں ہے تیز
تھا کبھی فرمان جس کا ناگزیر — جس کے در کے تھے کبھی سلطاں فقیر
اب اسے وصفِ قناعت سے ہے ساز — اب گدائی پر کیا کرتا ہے ناز
شیخ احمد[1] سیدِ گردوں جناب — مہر جن کے نور سے ہے فیضیاب
سبزہ بھی ان کے مزارِ پاک کا — جاگتا ہے لاالٰہ کہتا ہوا
ایک دن بولے مریدوں سے حضور — رہنا افکارِ عجم سے دور دور
لاکھ اس کی فکر لامحدود[2] ہے — اس پہ راہِ دینِ حق مسدود[3] ہے
قول اس آقائے ملّت کا نہ بھول — رمز، بھائی! اس نصیحت کو نہ بھول
فکر کی نسبت عرب سے چاہیئے — تا کہ مسلم اصل میں مسلم بنے

[1] حضرت شیخ احمد رفاعیؒ [2] عجمی فکر و دانش کی طرف اشارہ ہے [3] یہاں یہ قافیہ ناگزیر تھا۔ ۱۲۔ (کوکب)

حسنِ سیرت ملّیہ کا بیان جو آدابِ محمدیّہ سے درسِ ادب کے حصول میں مضمر ہے

ایک دن اک سائلِ معذور نے
در ہمارا کھٹکھٹایا زور سے

میں نے اس کے سر پہ ڈنڈا جڑ دیا
جو بھی تھا کشکول میں سب گر پڑا

عقل آغازِ جوانی میں بھلا
سوچتی ہی کب ہے اچھا اور برا

میرے والد نے جو دیکھا ماجرا
دیکھتے ہی زرد چہرہ ہو گیا

اور پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے
آنکھ سے رخسار پر بہنے لگے

بھول کر جیسے پرندہ چہچہے
شاخ بر بادِ سحر سے کانپ اٹھے

میں بھی تڑپا یہ قیامت دیکھ کر
دل نہ سنبھلا ان کی حالت دیکھ کر

وہ یہ بولے "کچھ خبر بھی ہے تجھے
کل جب آئیں گے نبیؐ کے سامنے

غازیانِ ملّتِ بیضا تمام
حافظانِ حکمتِ رعنا تمام

ان میں ہوں گے سب شہیدانِ کرام
جن کا اونچا ہے ستاروں سے مقام

زاہدوں میں عاشقانِ دل فگار
عالموں میں عاصیانِ شرمسار

پیشِ پیغمبرؐ وہیں روتا ہوا
یہ گدائے بے نوا بھی آئے گا

کیا کہوں گا میں؟ مجھے تو ہی بتا
مجھ سے جب پوچھیں گے فخرِ انبیاؐ

تجھ کو یہ فرزند جو حق نے دیا
کیوں مرے آداب سے غافل رہا؟

کارِ آساں میں رہا تو مضمحل
بن سکا آدم نہ یہ انبارِ گِل"

نرم گفتارِ ملامت تھی اُدھر
سخت شرمندہ ادھر تھا میں مگر

"ڈال" وہ پھر مجھ سے بولے اے پسر!
امتِ خیر البشر پر اک نظر

دیکھ پھر تو یہ میری ریش سفید
اور میرا لرزۂ بیم و امید

باپ پر یہ جور زیبا نہ کر
پیشِ مولا بندے کو رسوا نہ کر

تو کہ شاخِ مصطفیٰؐ کا غنچہ ہے
پھول بن جانے سے کیوں وارستہ ہے

رنگ و بو کے ساتھ تجھ کو چاہئے
خُلق ان کے خُلق سے حاصل کرے

مرشدِ رومیؒ کا یہ ارشاد ہے ۔۔۔ جن کے قطرہ میں سمندر شاد ہے
دامنِ ختم الرسلؐ مت چھوڑنا ۔۔۔ منہ اگر موڑے تو خود سے موڑنا
طبعِ مسلم ہے، میاں! رحم و کرم ۔۔۔ ہاتھ ہوں یا ہو زبان، رحم و کرم
جس نے انگلی سے کیا مہ کو دو نیم ۔۔۔ خود ہے رحمت[1] خلق ہے اس کا عظیم[2]
راہ سے اس کی اگر بھٹکا کہیں ۔۔۔ یہ سمجھ لے تو کہ ہم میں سے نہیں
تیرا گلشن ہے ہمارا گلستاں ۔۔۔ رہ ہمارا ہم صفیر و ہم زباں
نغمہ پیرا ہو تو سب کے ساتھ ہو ۔۔۔ سب کا نغمہ ایک ڈھب کے ساتھ ہو
زندگی کا جو بھی ہے سرمایہ دار ۔۔۔ موت ہے اس کی رہِ ناسازگار
تو اگر اہلِ چمن سے ہے نو بن ۔۔۔ ہمنوائے نغمہ سنجانِ چمن
ہے اگر شاہیں تو دریا میں نہ جی ۔۔۔ خلوتِ صحرا ہے تیری زندگی
ہے جو انجم، اپنے گردوں پر چمک ۔۔۔ دائرے سے اپنے باہر مت لپک
قطرہ لے جائے جو نیساں سے پرے ۔۔۔ پرورش اس کی گلستاں میں کرے

---

[1] نبی کریم کے اسم صفت ،، رحمۃ اللعالمین" کی طرف اشارہ ہے [2] آیۂ شریفہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم کی طرف اشارہ ہے،
(کوکب)

تیرا مقصد ہو کہ فیضانِ بہار
اس کو دے دے غنچۂ نو کا نکھار

صبحدم جیسے شعاعِ آفتاب
ہر شجر کے واسطے بنتی ہے تاب

اس کے جوہر میں رہے گا پھر وہ نم؟
سالماتِ[1] قطرہ میں ہوگا وہ رم؟

تیرا گوہر بھی ہے بس اک موجِ آب
اور ہر صورت میں ہے شکلِ سراب

قطرۂ نیساں سمندر سے جدا
اور کیا ہے اشک شبنم کے سوا

بحر میں رکھ کر اسے گوہر بنا
آسماں تک ہے ستارے کی ضیا

طینتِ مسلم ہے اک درِّ خوش آب
اس میں ہے بحرِ نبیؐ سے آب و تاب

آب نیساں ہے تو اس قلزم میں پل
بن کے موتی اس سمندر سے نکل

پھر جہاں میں غیرت خورشید ہو
صاحب تابانیِ جاوید ہو

بیان حیاتِ ملیہ جسے مرکز محسوس کی ضرورت ہے اسی کو بیت الحرام کہتے ہیں۔

[1] سالمات: اجزائے ترکیبی ۱۲

کھولتا ہوں عقدۂ کارِ حیات
تا ہو تو آگاہِ اسرارِ حیات

فکر کی صورت ہے اس میں خود دہری
ہر جہت سے اس کا دامن ہے بری

یہ جہانِ دیر و زود اس کا نہیں
وہ اسیرِ ماضی و فردا نہیں

ڈال اپنی ذات پر تو اک نظر
جز رمِ بیہم ہے کیا؟ اے بیخبر!

آتش نادیدہ ہو جب تک بلند
کر دہوں سے اپنے اس کو پردہ بند

اس کی رو جب تک نظر آئے سکوں
رہتی ہے وہ آب گوہر کا فسوں

آتش خاموش رہ کر سربسر
لالہ بن کر اگتی ہے پھر شاخ پر

فکر تیری ہے گراں خیز اور لنگ
گُل نشینی ہے اسے پروازِ رنگ

زندگی مرغِ نشیمن ساز ہے
رنگ کیا کچھ اور جز پرواز ہے؟

ہے قفس میں روحِ آزادی بھی ہے
نغمہ پیرا بھی ہے، فریادی بھی ہے

بال و پر ہیں اس کے پروازی مزاج
کرتی ہے اپنے مرض کا خود علاج

کرتی ہے پیدا وہ خود دشواریاں
پھر بناتی ہے اُنہیں آسانیاں،

پا بگل ہو کر حیاتِ تیز گام — تازہ کر لیتی ہے خود ذوقِ خرام

ساز اس کے سوز میں خوابیدہ ہیں — دوش و فردا حال کے زائیدہ ہیں

دمبدم مشکل گر اور آساں گزار — دمبدم نو آفریں اور تازہ کار

مثلِ بو رہتی ہے ہر دم رہ سپر — سانس بن کر کرتی ہے سینے میں گھر

اپنے ہی حلقوں سے بنتی ہے زرہ — تکمہ بن کر ڈالتی ہے خود گرہ

دانہ ہے جب تک تو خود ہے برگ و بر — کھول کر خود آنکھ بنتی ہے شجر

یہ لباسِ آب و گِل بنتی ہے خود — دست و پا اور چشم و دل بنتی ہے خود

آپ ہی ہے تن گزینی زندگی — خود ہے محفل آفرینی زندگی

ہے اسی صورت سے میلا دائم — زندگی مرکز پہ ہوتی ہے بہم

حلقہ و مرکز ہیں مثلِ جسم و جاں — دائرہ ہے جیسے نقطے میں نہاں

قوم کا مرکز ہے اصلِ ربط و نظم — ہے فقط مرکز سے قائم ضبط و نظم

راز دار اور راز ہے بیت الحرم — اپنا سوز و ساز ہے بیت الحرم

سانس کی صورت وہاں پلتے ہیں ہم
ہے وہی سینہ جہاں پلتے ہیں ہم

اس کی شبنم سے ہے اپنا گلستاں
اس کے زمزم سے ہیں اپنی کھیتیاں

اس کے ذرّوں سے ہے روشن آفتاب
وارتا ہے اس پہ تن من آفتاب

اس کے دعوے کی دلیل اپنا وجود
یعنی برہانِ خلیلؑ اپنا وجود

اس کے دم سے ہم بلند آوازہ ہیں
اور قدم کے ساتھ ہم شیرازہ ہیں

طوف سے اس کے ہے ملّت ہم نفس
مثلِ صبحِ مہر پابندِ قفس

اپنی کثرت اس سے وحدت میں ڈھلی
اپنی خودداری اسی گھر میں پلی

ہم ہیں خود زندہ حرم کے طوف سے
اور پائندہ حرم کے طوف سے

جز بہ جمعیّت نہیں جانِ امم
اپنی جمعیّت بھی ہے سرِّ حرم

کھول آنکھیں، حال کچھ دنیا کا دیکھ
آج انجام امّتِ موسیٰ کا دیکھ

ہاتھ سے جب دامنِ مرکز چھٹا
رشتۂ جمعیّتِ ملّت گیا

گود میں نبیوں کی جو اُمّت پلی
تھے خفی بھی جس کو اسرارِ جلی

جب ہوئی غافل تو چوٹ ایسی پڑی
زندگی خوں ہو کے آنکھوں سے بہی

مزرعِ ملّت سے نم جاتا رہا
شاخِ ہستی کا بھرم جاتا رہا

بیکسی میں ہم زباں سب گم ہوئے
ہم نوا، ہم آشیاں سب گم ہوئے

شمع مردہ، نوحہ خواں پروانہ ہے
کتنا عبرت خیز یہ افسانہ ہے

جورِ گردوں سے ہے تو بھی خستہ تن
ہے اسیر التباس و وہم و ظن

اب بدل لے پیرہن احرام سے
صبح پیدا کر غبارِ شام سے

ڈوب جا سجدے میں آبا کی طرح
بن انہیں سجدہ سراپا کی طرح

لے کے آئے پیشِ حق ایسا نیاز
جس کے آگے جھک گیا دنیا کا ناز

راہِ حق میں آبلہ پائی کے بعد
گل بداماں تھے جبیں سائی کے بعد

حقیقی جمعیّت ملّی نصب العین پر مضبوط گرفت کا نام ہے اور امّت محمدّیہ کا نصب العین توحید کی حفاظت و اشاعت ہے،

مجھ سے سن کیا ہے زبان کائنات
ہیں، سمجھ، الفاظ اعمالِ حیات

گر کسی مقصود سے وابستہ ہے
اس کو مقصد کی اگر مہمیز ہو
مدّعا سے ہے بقائے زندگی
زندگانی ہو اگر مقصد شناس
شرطِ ہستی ہو جو مقصد کا حصول
ناخدا پلتا ہے ساحل کے لئے
داغِ پروانہ بنا ہے ذوقِ سوز
قیس آوارہ ہے صحرا میں اگر
شہر کے اندر اگر لیلےٰ ملے
ہر عمل کا دم قدم مقصود ہے
گردشِ خوں کی رگوں میں ہے بنا
گرمیِ مقصد سے ہے سوزِ حیات

زندگانی مطلعِ برجستہ ہے
توسن ہستی ہو اسے تیز ہو
جمع ہیں اس سے قوائے زندگی
ضابطِ اسباب عالم ہوں حواس
ہو اسی کے واسطے ردّ و قبول
جادہ پیمائی سے منزل کے لئے
وجہ طوفِ شمع کیا ہے ذوقِ سوز
محملِ لیلےٰ ہے مقصودِ نظر
پھر کوئی صحرا بصحرا کیوں پھرے
ہر عمل کا کیف و کم مقصود ہے
صرف اک سعیِ حصولِ مدعا
ہے وہی سرمایہ اندوزِ حیات

مدّعا ہی قوتِ اعصاب ہے
سازِ ہمّت کے لئے مضراب ہے

بہر دستِ قوم گُل چینی ہے یہ
سیکڑوں نظروں کی بک بیتی ہے یہ

شاہدِ مقصود کا دیوانہ بن
شمعِ مقصد ہی کا تو پروانہ بن

نغمہ سازِ قمؔ[1] نے کیا اچھا کہا
ساز کو سازِ معانی کر دیا

"پاؤں کے کانٹے پہ ڈالی تھی نظر
چھُپ گئی محمل نگاہوں سے ادھر[2]

ایک لمحے کے لئے غافل ہوا
دور لاکھوں کوس منزل سے ہٹا[3]

یہ کہن تن جس کا عالم نام ہے
امتزاجِ امہات[4] اندام ہے

سو نیستاں بو کے اک نالہ اگا
خونِ صد گلشن سے اک لالہ اگا

سیکڑوں نقشوں پہ کی مشقِ ہنر
تب ہوا جا کر ترا رخ جلوہ گر

جب دیا نانوں سے جانوں کو فروغ
تب ملا ہے ان اذانوں کو فروغ

مدّتوں لڑتا رہا احرار سے
مل کے۔ آقایانِ باطل کار سے

---

[1] ملک قمی (ایک ایرانی شاعر۔ [2] رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر [3] یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد [4] امہات۔ عناصر (کوکبؔ)

تخمِ ایماں آخرش بویا گیا ۔ کلمۂ توحید لب پر آگیا
نقطۂ ادوار ٹھہرا لا الٰہ ۔ انتہائے کار ٹھہرا لا الٰہ
ہے اسی سے چرخ میں گرندگی[1] ۔ مہر میں پابندگی، رخشندگی
گوہر اس کی تاب سے گوہر بنا ۔ ہے اُسی سے سلسلہ امواج کا
خاک اس کی پرورش سے گُل بنی ۔ بلبل اس کے سوز سے بلبل بنی
تاک[2] میں ہے اس کے شعلے کی لپک ۔ خاکِ مینا میں اسی کی ہے چمک
اس کے نغموں کا ہے گھر سازِ وجود ۔ ہاں بجا اے نغمہ گر! سازِ وجود
سازِ ہستی ہے ترا خونِ بدن ۔ تو اسی کے تار پر ہو زخمہ زن
تیری ہستی ہے صلہ تکبیر کا ۔ حفظ و نشر لا الٰہ ہے مدّعا
بانگِ حق جب تک نہ ہو جائے بلند ۔ جو بھی مسلم ہے رہے گا دردمند
دیکھ پڑھ کر آیۂ اُمّ الکتاب ۔ اُمّتِ عادل ہے تیرا ہی خطاب
آب و تابِ چہرۂ ایام ہے ۔ تو یہاں شاہد علی الاقوام ہے[3]

[1] گرندگی۔ گردش [2] تاک انگور کی بیل [3] آیۂ شریفہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

نکتہ سنجوں کو صلائے عام دے　　علمِ اُمّیؐ[1] کا انہیں پیغام دے

کیسا اُمّیؐ جو ھویٰ سے ہے بری[2]　　قول اس کا مَاغَویٰ[3] سے ہے بری

انگلیاں رکھ کر بہ نبضِ کائنات　　اس نے کھولے رازِ تقویمِ حیات

داغ تھے جتنے قبائے دہر پر　　دھو دیئے اُس نے بہ فیضِ یک نظر

زیست اس کے دین سے وابستہ ہے　　اور اس آئین کی پابستہ ہے

ہے کتاب اس کی ترے زیرِ بغل　　پھر تو میدانِ عمل میں تیز چل

فکرِ انساں بتگری ہے جس کی خو　　کر رہی ہے نقشِ نو کی جستجو

اس کو خوئے آذری ہے خوشگوار　　گھڑ لیا ہے اک نیا پروردگار

خونفشانی ہے اسے وجہ طرب　　نام اس کے رنگ اور ملک و نسب

چڑھ رہی بھینٹ اب تک سربسر　　آدمیّت اس کی قرباں گاہ پر

تو ہے وارثِ دارِ مینائے خلیلؑ　　ہے رگوں میں تیری صہبائے خلیلؑ

---

[1] رسولِ امّیؐ [2] قول باری تعالیٰ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ [3] رسول کریم کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَویٰ کی طرف اشارہ ہے (کوکب)

کر دو نیم اس حق نما باطل کا سر
تیغ لَا مَوْجُودَ اِلَّا[1] کھینچ کر

دور یہ تاریکیِ ایام کر
اپنی اُس تکمیل[2] دیں کو عام کر

کیا خجل ہوگا نہ تو روزِ شمار؟
جب کہیں گے آبروئے روزگار[3]

حرفِ حق کی جو امانت ہم سے لی
اس کی دُنیا میں اشاعت کیوں نہ کی؟

توسیعِ حیاتِ ملی نظامِ عالم کی تسخیرِ قویٰ کا نام ہے

تو کہ عبدِ ہستیِ نادیدہ ہے
سیل ہے، ساحل سے دامن چیدہ ہے

باغِ ہستی میں شجر بن، جڑ پکڑ
دل لگا غائب سے اور حاضر سے لڑ

ہستیِ حاضر ہے کیا؟ تفسیرِ غیب
بنتی ہے دیباچۂ تسخیرِ غیب

ماسوا تسخیر کی خاطر بنے
امتحانِ تیر کی خاطر بنے

"کن" سے حق نے ماسوا پیدا کئے
دے دیا ہے غیر حق پر حق تجھے

فرحتِ عقدہ کشائی کے لئے
زحمتِ عقدہ کشائی چاہئے

۱؎ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوْ ۲؎ آیہ شریفہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ کی طرف اشارہ ہے۔ ۳؎ پیغمبرؐ ۱۲-

تو کلی ہے تو چمن تعمیر کر — ذرّہ ہے تو مہر کی تسخیر کر

کارِ نادر، ہے اگر ممکن تو کر — شیر برفِ دہر کا پگھلا جگر

جس نے محسوسات پر قبضہ کیا — ذرّے سے تعمیر عالم کر لیا

کر لیا جس نے ملائک کو شکار — پہلے آدم پر کیا تھا اس نے وار

پہلے محسوسات کی کھولی گرہ — تب ہی موجودات کی کھولی گرہ

کوہ و صحرا کیا ہیں؟ کیا ہیں بحر و بر؟ — تختہ ہائے مشق اربابِ نظر

ہے تری کم آگہی کی انتہا — عالم اسباب کو 'دوں' کر دیا

کھول، غافل! دیدۂ مخمور کو — 'دوں' نہ جان اس عالم مجبور کو

اس کا مقصد ہے تری توسیعِ ذات — یہ جہاں ہے امتحانِ ممکنات

مارتا ہے تجھ کو رکھنے کے لئے — خون کی گرمی پرکھنے کے لئے

مار سینے پر کوئی سنگِ گراں — ہے یہی تو امتحانِ استخواں

یہ جہاں ہے نیک بندوں کے لئے — اس کا جلوہ حق پسندوں کے لئے

یہ جہاں ہے کارواں کی رہگذار
کر شکار اس کو، نہ بن اس کا شکار

تیرا رخشِ فکر ہو بالا پرست
احتیاج زندگی ہے راہبر

تا کہ تسخیر نظامِ دہر سے
نائبِ حق ہو جہاں میں آدمی

تیری تنگی کو ہو پہنائی نصیب
دہر میں پشت ہوا پر ہو سوار

کوہساروں کی رگوں سے خوں نچوڑ
اک فضا سے سو جہاں ہوں گے عیاں

آشنائے جلوہ کر نادیدہ کو
لے چمک خورشیدِ عالمتاب سے

یہ جہاں ہے نقد مومن کا عیار
ورنہ سمجھے گا تجھے خدمتگزار

وسعتِ گردوں ہے اسکی ایک جست
ہے زمیں پر رہ کے بھی گردوں سپہر

پختہ تر تیری ہنرمندی بنے
ہو عناصر پر گرفت اس کی کڑی

دستِ قدرت کو ہو گیرائی نصیب
تیرے قابو میں رہے یہ راہوار

ایک گوہر قعرِ دریا میں نہ چھوڑ
سیکڑوں سورج ہیں ذرّوں میں نہاں

کھول دے اسرارِ نافہمیدہ کو
برقِ طاق افروز لے سیلاب[1] سے

---

[1] پانی سے بجلی پیدا کرنے کا سائنسی کمال آج ایک عام بات ہے۔

ثابت و سیّارہ، یہ گردوں وطن
پوجتی تھیں ان کو اقوامِ کہن

آج یہ سب پیکرانِ نور پوش
آدمِ خاکی کے ہیں حلقہ بگوش

جستجو کو پختہ کر تدبیر سے
پھر نبٹ آفاق کی تسخیر سے

کھول کر آنکھیں ذرا اشیا کو دیکھ
نشّۂ پوشیدۂ صہبا کو دیکھ

حکمتِ اشیا سے ہو گر سرفراز
ناتواں سمجھے توانائی کا راز

صورتِ ہستی بھی ہے معنی سے پر
یہ پرانا ساز بھی رکھتا ہے سُر

پوچھ اس کا سُر کسی ہشیار سے
خود لپٹ جائے جو اس کے تار سے

تو ہے مقصودِ خطابِ انظری
تجھ میں کیا باقی نہیں دیدہ وری؟

قطرہ محوِ خوفروزی ہے اگر
تاک میں مے، گل پہ شبنم کا گُہر

بحر میں بھی اصل گوہر ہے وہی
ضوفشاں مانندِ اختر ہے وہی

پھول کی صورت کا متوالا نہ بن
معنیِ گلزار میں ہو غوطہ زن

حکمتِ اشیا کا جو ہے راز دار
ہے وہی برق و حرارت پر سوار

حرف لے اڑتا ہے معنی کی طرف — غیرِ زخمہ نغمہ ریزی کی طرف
تو رہِ مشکل سے ہے ناآشنا — زیست کی منزل سے ہے ناآشنا
ہمسفر تیرے ہوئے منزل نصیب — لیلیِ معنی کو لے آئے قریب
تو مثالِ قیس ابھی آوارہ ہے! — خستہ ہے، واماندہ ہے، بیچارہ ہے!!
علمِ آسما[1] سے ہے آدم کا وقار — حکمتِ اشیا ہے انساں کا حصار

حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملّت فرد کی طرح احساسِ خودی پیدا کرے اور اس احساس کی تولید و تکمیل ملّی روایات کے ضبط ہی سے ممکن ہے

دیکھ بچے کو ذرا بالغ نظر! — اپنی اصلیّت سے ہے جو بے خبر
فرق قرب و بعد سے واقف کہاں — چاہتا ہے چاند کی پکڑے عناں

[1] آیۂ شریفہ "عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ" کی طرف اشارہ ہے۔ (کوکب)

ہوش رکھتا ہے ابھی ماں کے سوا — گریہ کا یا دودھ کا یا نیند کا
زیر و بم سے کان ہیں نا آشنا — نغمہ اس کو شور ہے زنجیر کا
پیش پا افکار کا دلدادہ ہے — گفتگو میں بھی نہایت سادہ ہے
جستجو ہی پر ابھی مجبور ہے — گفتگو چون و چرا سے دور ہے
کمسنی ہے این و آں کی نقش گیر — غیر جوئی غیر بینی کی اسیر
پشت سے رکھ دو اگر آنکھوں پہ ہاتھ — چھوڑ دیں اس کے حواس اکدم ہی ساتھ
فکرِ خام اس کی میانِ روزگار — پر کُشا ہے مثلِ بازِ نو شکار
چھوڑ کر صیدِ سبک رو کی طرف — موڑ لاتی ہے اسے اپنی طرف
مشتعل جب تک ہو آگ افکار کی — گلفشاں ہے پھلجھڑی پندار کی
آنکھ اٹھتی ہے فقط تن کی طرف — ملتفت رکھتی ہے بس "من" کی طرف
حافظہ کرتا ہے اس کو خود شناس — دوش و فردا کو بلاتے ہیں حواس
روز و شب اس کے ہیں یوں باہمدگر — جیسے پیش و پس لڑی میں ہوں گُہر

ہوتے رہتے ہیں کم و بیش آب و گل — "میں وہی ہوں" سوچتا رہتا ہے دل

ہے یہی فکرِ "من" آغازِ حیات — "نغمۂ بیداریِ سازِ حیات"[۱]

طفل ہی ہے ملّتِ نوزادہ بھی — خود وہی، آغوشِ مادر بھی وہی

یہ خودی سے اپنی ہے نا آشنا — جیسے اک موتی ہو مٹی میں پڑا

دوش و فردا آشناؤں میں نہیں — حلقۂ ایام پاؤں میں نہیں

چشمِ ہستی میں یہ پُتلی ہے ضرور — اپنی نظروں سے مگر رہتی ہے دور

اپنے دل کی ساری گرہیں کھول دے — تب سرِ تارِ خودی شاید ملے

دل سے لگ جائے بکارِ روزگار — پھر شعورِ تازہ ہوگا پائدار

نقش اس کے کچھ تو لے کچھ چھوڑ دے — سرگزشت اپنی مکمّل یوں کرے

فرد توڑے رشتۂ ایام اگر — شانۂ ادراک ٹوٹے سر بسر

شمعِ ملّت کی ضیا تاریخ ہے — خود شناسی کی بنا تاریخ ہے

ذہن سے ماضی نکل جائے اگر — چل پڑے قعرِ عدم کی راہ پر

---

[۱] موزونیت اور محل کے لحاظ سے اقبال کے اس مصرع کا ہم پایہ ترجمہ ممکن نہیں ہے (کوکب)

نسخۂ ہستی کا تیرے، ہوشمند! — رشتۂ ایّام ہے شیرازہ بند

ہے یہی رشتہ ہمارا پیرہن — سوئی ہے حفظِ روایاتِ کہن

تو جو یوں تاریخ سے بیگانہ ہے — کیا کہانی ہے؟ کوئی افسانہ ہے!

تو اگر تاریخ سے آگاہ ہے — آشنائے کار و مردِ راہ ہے

روح کا سامانِ راحت ہے یہی — پیکرِ ملّت کی قوّت ہے یہی

پہلے دیتی ہے ترے خنجر کو دھار — پھر صلائے کارزارِ روزگار

کس قدر یہ سازِ جاں ہے دل پذیر — نغمے ہیں گائے ہوئے اس میں اسیر

شمعِ افسردہ میں اس کا سوز دیکھ — دوش کا آئینۂ امروز دیکھ

کوکبِ بختِ امم ہے یہ دیا — امشب و دیشب میں ہے اس کی ضیا

عہدِ رفتہ پر بھی ہے اس کی نظر — یہ دکھاتی ہے تجھے خود دیکھ کر

عرق[۱] دوشینہ اسی ساغر میں ہے! — کیفِ پارینہ اسی ساغر میں ہے!!

ساری ملّت اس نے زیرِ دام کی — بن کے طائر پھر چمن سے اڑ گئی

۱؎ عرق۔ شراب ۱۲

یاد کر تاریخ کو، پائندہ ہو
ان گنے انفاس سے پھر زندہ ہو

دوش کو ہم رشتۂ امروز کر
زندگی کو مرغِ دست آموز کر

رشتۂ ایام کو کر زیرِ دست
ورنہ ہوگا روز کور[1] اور شب پرست

عہدِ رفتہ ہی بنائے حال ہو
حال کا آئینہ استقبال ہو

رشتۂ ماضی بہ استقبال و حال
ہے نشانِ زندگیِ لازوال

موجِ ادراکِ تسلسل ہے حیات!
میکشوں کو شورِ قُلقُل ہے حیات!!

نوعِ انسانی کی بقا امومت سے ہے اور امومت کا حفظ واحترام اسلام ہے

زخمہ زن ہے زن اگر، ہے مرد ساز
ہے نیازِ زن سے قائم اس کا ناز

مرد اگر ہے تن تو ہے پوشاکِ زن[2]
حسنِ دل جو عشق کا ہے پیرہن!

[1] روز کور: جسے دن میں نظر نہیں آتا۔ [2] آیۂ شریفہ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ (عورتیں تمہارا لباس ہیں) کی طرف اشارہ ہے (کوکب)

عشق اس کی گود کا پروردہ ہے
اس نوائے راز کا وہ پردہ ہے

جس پہ نازاں ہے وجودِ کائنات
تھیں پسند اس کو نسا، طیب و صلوٰۃ"

جس مسلماں نے اسے سمجھا کنیز
رمزِ قرآں کی نہیں اس کو تمیز

کیوں امومت کو نہ رحمت جانئے
جبکہ نسبت ہے نبوت سے اُسے

اس کی شفقت شفقتِ پیغمبری
سیرتِ اقوام کی صورت گری

اپنی یہ تعمیر امومت ہی سے ہے
صورتِ تقدیر امومت ہی سے ہے

اس جگہ ذہنِ رسا کب رکتے ہیں
حرفِ اُمّت میں ہزاروں نکتے ہیں

یاد رکھ یہ قولِ وجہ کن فکاںؐ
ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے جاں[1]

عزتِ ارحام ہے ملّت کا کام
ورنہ کارِ زندگی ہے ناتمام

ہے امومت جوشِ رفتارِ حیات
ہے اسی سے کشفِ اسرارِ حیات

اپنے دریا کا وہی ہے پیچ و تاب
ہے اسی سے موج و گردابِ حباب

ایک وہ لڑکی کہ ہے جاہل، گنوار
پستہ قد، فربہ بدن، تیرہ عذار

۱؎ اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ (حدیث)

تربیت اچھی نہ اچھی پرورش
کم نظر، کم گو ہے اور سادہ روش

زچگی کے بعد وہ حال زبوں
گرد آنکھوں کے وہ حلقے نیلگوں

پھر بھی گر ملّت کو اس کی گود سے
مردِ غیرت مند و حق پرور ملے

اس کا غم طاقت ہے ملّت کے لئے
اس کا دم رحمت ہے ملّت کے لئے

اک یہ لڑکی جو تہی آغوش ہے
گو قیامت ہے، جواہر پوش ہے

فکرِ مغرب کا مگر مخزن ہے یہ
زن ہے لیکن اصل میں نازن ہے یہ

توڑ دیں ملّت کی اس نے بندشیں
آنکھ میں عشوے ہیں دل میں شورشیں

ہے سراسر شوخ چشم اور فتنہ زا
اس کی آزادی حیا نا آشنا

علم اس کا ہے نہالِ بے ثمر
بے ثمر، بے غنچہ و گل، بے بصر

اس کو ہے بار امومت سے گریز
نجم ہے لیکن نہیں ہے نور بیز

دور بہتر ہے یہ گُل اس باغ سے
شرم آتی ہے ہمیں اس داغ سے

اپنی خاکستر میں انگارے بہت
لا الٰہ کہتے ہوئے تارے بہت

جو سوادِ کیف و کم سے دور ہیں
پردۂ ظلمات میں مستور ہیں

وہ شرارے برقِ نامشہود کے
ہیں ہماری ظلمتِ موجود کے

پھول تک شبنم ابھی آئی نہیں
لی ابھی غنچوں نے انگڑائی نہیں

کاش ہو یہ لالہ زارِ ممکنات
رونقِ صحنِ ریاضِ اُمّہات[1]

قوم کا سرمایہ اے صاحبِ نظر!
کب ہے یہ نقد و قماش و سیم و زر

مال ہیں فرزند ہائے تندرست
ذہن میں اعلیٰ بدن میں چاق و چست

حافظِ رمزِ اخوّت مائیں ہیں
قوتِ قرآں و ملّت مائیں ہیں

مسلمان عورتوں کے لئے سیّدۃ النسا فاطمہ زہراؓ اسوۂ کاملہ ہیں

قدرِ مریمؓ حضرت عیسیٰ سے ہے
قدرِ زہراؓ کیلئے ہیں تین شے

احمدِ مختارؐ کی دختر ہیں یہ
سیّدِ ابرارؓ کی دختر ہیں یہ

---

[1] اُمّہات ۔ عناصر

باپ ان کے وجہ خلق دو جہاں   دہر کا آئین نو جن کی زباں
شوہر ان کے تاجدار هَلْ اَتیٰ   مرتضیٰؓ مشکل کشا، شیرِ خدا
دیکھ حال اس شاہ کے ایوان کا   ایک تلوار، اک زرہ سامان تھا
ایک بیٹا مرکزِ پرکارِ عشق   راہِ حق میں کارواں سالارِ عشق
آتشِ فتنہ بجھانے کے لئے   اور کیا، تاج و نگیں ٹھکرا دیئے
دوسرا مولائے ابرارِ جہاں!   قوتِ بازوئے احرارِ جہاں!!
زندگی کا سوز پیہم ہیں حسینؓ   حریت آموزِ عالم ہیں حسینؓ
وصف یہ اولاد کا ماؤں سے ہے   جوہر صدق و صفا ماؤں سے ہے
مزرعِ تسلیم کا دل ہیں بتولؓ   ماؤں کو ایک درس کامل ہیں بتولؓ
اک گدائے بے نوا کے واسطے   اب تو کوئی اپنی چادر بیچ دے
آتشی نوری نگاہوں میں حقیر   اپنے شوہر کی مگر فرماں پذیر
شکر، کھا کر نانِ جو پانی کے ساتھ   لب پہ قرآں آسیا رانی کے ساتھ

دامنِ بالش[1] سے گریہ لے نیاز
گوہر افشانی کو دامانِ نماز

گوہر اشک اس کے جبریلِ امیںؑ
لے کے جاتے جانب عرشِ بریں

سامنے ہے میرے آئینِ خدا
اور فرمانِ جنابِ مصطفےٰ

لوٹتا ورنہ مزارِ پاک پر
سجدے کرتا جاکے اس کی خاک پر

خطاب بہ مخدّراتِ اسلام

تیری چادر پردۂ ناموس ہے
روشنی تیری دلِ فانوس ہے

پاک طینت تیری رحمت ہے ہمیں
زورِ دیں، بنیادِ ملّت ہے ہمیں

دودھ سے جونہی ہٹی اس کی نگاہ
تو نے بچّے کو سکھایا لا اِلٰہ

مہر سے تیری ملے اطوار بھی
فکر بھی، گفتار بھی کردار بھی

جو تری آغوشِ رحمت میں پلے
برق بن کر کوہ و صحرا میں پھرے

تو امینِ نعمتِ آئینِ حق
تیری سانسوں میں ہے سوزِ دینِ حق

[1] بالش: تکیہ

عصرِ حاضر ہے سراسر پُرفتن — نقدِ دیں کا کاروانِ راہزن
اس کی دانش کور، یزداں ناشناس — اس کے پیرو سب پراگندہ حواس
آنکھ بیباکی کی اک تصویر ہے — پنجۂ مژگاں بھی دامن گیر ہے
اس کے کشتوں کو ہے جینے کی امید — قید کو کہتے ہیں آزادی کی دید
آبِ بندِ نخلِ جمعیّت ہے تو — حافظِ سرمایۂ ملّت ہے تو
خدشۂ سود و زیاں سے دور رہ — شیوۂ اسلاف پر مامور رہ
بہ نہ جائیں سیلِ نو کے جوش میں — اپنے فرزندوں کو لے آغوش میں
پر کشا ہونے سے پہلے یہ طیور — جا پڑے ہیں آشیاں سے اپنے دور
اپنی فطرت دیکھ، پھر دنیا کو دیکھ — چشمِ دل سے اُسوۂ زہراؓ کو دیکھ
پھر ملے شاید تجھے دنیا میں چین — گود میں آئے تری کوئی حسینؓ

مثنوی کے مطالب کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی روشنی میں

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ

ایک شب صدیقؓ آئے خواب میں ۔ آسماں سے پھول برسے خواب میں
آمَنَ النَّاس[1] اور وہ مخلص قدیم ۔ اپنے کوہ طور کا پہلا کلیم
کشتِ ملت کے لئے بارندہ ابر ۔ ثانیٔ اسلام، انیس غار و بدر
عرض کی میں نے کہ تو ہے جانِ عشق ۔ عشق تیرا مطلع دیوانِ عشق
تو محافظ ہے اساسِ کار کا ۔ کچھ علاج اب اس مرض کا بھی بتا
آپ بولے "صید لالچ کا نہ ہو ۔ سامنے رکھ سورۂ اخلاص کو
یہ نفس سینوں میں ہے جو تار سا ۔ کچھ نہیں ہے سرِّ وحدت کے سوا
رنگ اس کالے کے، بن اس کی مثال ۔ تاکہ اس کا بن سکے عکسِ جمال
نام تیرا جس نے مسلم کر دیا ۔ پاک بھی تجھ کو دو رنگی سے کیا
نام تیرا ترک و افغان ہے ابھی ۔ جو کبھی تھا آج تک تو ہے وہی
نام کا اب یہ بتِ دیرینہ توڑ ۔ خم سے وابستہ ہو تو شیشوں کو چھوڑ
نام کے چکر میں تو ایسا پڑا ۔ خام ہی اپنے شجر سے گر گیا

۱؎ آمَنَ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوْ بَکْرٍ (حدیث)

ایک کا ہو جا، دوئی سے کر حذر
پارہ پارہ اپنی وحدت کو نہ کر

ایک کے بندے! جواب تک تو ہے تو
چھوڑ دو دو کی پرستاری کی خو

گوشِ دل سے بات سن یہ راز کی
لب پہ جو کچھ ہو وہی ہو دل میں بھی

سو بنا لیں ایک ملّت چھوڑ کر
رکھ دیا خود قلعہ اپنا توڑ کر

ایک ہو، توحید کو مشہود کر
کر عمل، غائب کو یوں موجود کر

لذّتِ ایماں عمل ہی کا ہے پھل
مردہ ہے ایماں اگر ہے بے عمل

اَللّٰہُ الصَّمَدُ

جو بھی اَللّٰہُ الصَّمَد کا ہو رہا
اِس حدِ اسباب سے باہر ہوا

بندۂ حق بندۂ اسباب کیوں؟
زندگانی گردشِ دولاب کیوں؟

تو ہے مسلم، بے نیازِ غیر ہو
حق میں عالم کے سراپا خیر ہو

کر گلہ ہرگز نہ پیشِ اہلِ مال
اُن کے آگے مت بڑھا دستِ سوال

نانِ جو کھا کر بھی رہ شیرِ زمن — زیر کر مرحب کو، بن خیبر شکن
منتِ اہلِ کرم سے دور رہ — نشترِ لا و نعم[1] سے دور رہ
رزق ہیں منت کشِ دوناں[2] نہ ہو — ہو کے یوسف اس قدر ارزاں نہ ہو
مور بے مایہ ہو یا بے بال و پر — کوئی بھی خواہش سلیماں سے نہ کر
عاملِ اَقلِل مِنَ الدُّنیا تو بن — پھر تعِش حُرّاً[3] کا سمجھے گا چلن
تا بہ امکاں کیمیا بن، گل نہ بن — دہر میں منعم تو بن، سائل نہ بن
جانتا ہے تو مقامِ بوعلیؒ — مجھ سے لے کر پی یہ جامِ بوعلیؒ
"تخت کیکاؤس کو ٹھوکر لگا — جان دے، ذرہ نہ دے ناموس کا"
وہ تہی پیمانہ جو ہیں بے نیاز — ان پہ ہوتا ہے درِ میخانہ باز
یاد ہے ہاروں رشیدِ حق پرست! — جس نے دی نقفور[4] کو پیہم شکست
اس نے مالکؒ سے کہا اے فخرِ دیں! — آپ سے روشن ہے ملت کی جبیں

---

[1] ہاں اور نہیں ۱۲ [2] ذلیل۔ کمینے [3] قول فاروقؓ اُقلِل مِنَ الدُّنیا تَعِش حُرّاً کی طرف اشارہ ہے [4] رومی بادشاہ (کوکب)

آپ ہیں طوطیِ گلزارِ حدیث
دیں مجھے بھی درسِ اسرارِ حدیث

لعل ہو کر کیوں یمن میں قید ہیں
آکے اب دارالخلافت میں رہیں

دیکھئے تابانیِ روزِ عراق
دیکھئے حسنِ نظر سوزِ عراق

موجِ آبِ خضر اس کی تاک[۱] ہے!
مرہمِ زخمِ مسیحا خاک ہے!!

"خادمِ احمدؐ ہوں" مالکؒ نے کہا
کچھ غرض مجھ کو نہیں اس کے سوا

دیکھ مجھ کو اور اس فتراک کو!
چھوڑ دوں کیسے حریمِ پاک کو؟

زندگی میں خاکِ یثرب کا فراق!
شب کہاں اُس کی، کہاں روزِ عراق

یہ دیا ہے حکم مجھ کو عشق نے
پادشاہوں کو بھی خدمت میں نہ لے

چاہتا ہے تو مرا آقا بنے
بندۂ آزاد کا مولا بنے

آؤں میں تجھ کو پڑھانے کے لئے؟
خادمِ ملت ترا خادم بنے

علمِ دیں کا ہے اگر ذوق آشنا
جائے تدریسی میں آکر بیٹھ جا

بے نیازی کا عجب انداز ہے
بے نیازی اک طرح کا ناز ہے

[۱] تاک۔ انگور کی بیل ۱۲

بے نیازی رنگِ حق کا نام ہے — رنگ عالم سے اسے کیا کام ہے
دوسروں سے تو بھی علم اندوز ہے — ان کا غازہ تیرا رخ افروز ہے
ارجمندی ہے تری ان کا شعار — خود سے غافل دوسروں کا ہے شکار
تیری مٹی اس سے بنجر ہو گئی — خاکِ محرومِ گُلِ تر ہو گئی
دوسروں سے خواہش باراں نہ کر — اپنی کھیتی اس طرح ویراں نہ کر
ان کی دانش تیرے دل کی پھانس ہے — ان کا دم تیرے گلے کا سانس ہے
گفتگو تیری انہیں سے مستعار — آرزو تیری انہیں سے مستعار
قمریوں میں تیری مانگے کی نوا — سرو پر بھی تیرے مانگے کی قبا
جام میں ہے تیرے غیروں کی شراب — جام بھی ہے اب انہیں سے دستیاب
وہ نظر وہ سرِّ مَازَاغَ الْبَصَر[1] — کاش پھر ملّت میں آئے لوٹ کر
ہے شناخت اس شمع کو پروانے کی — ہے خبر اپنے اور بیگانے کی
لَسْتَ مِنِّی[2] تجھ سے جب آکر کہے — کیا تری عزّت زمانے میں رہے؟

[1] آیۂ شریفہ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی کی طرف اشارہ ہے ۱۲، [2] یعنی تو میری قوم سے نہیں ہے ۱۲ (کوکب)

زندگانی مثلِ انجم تابکے ؟ | اپنی ہستی صبح ہیں گم تابکے ؟
تو نے کھایا صبحِ کاذب کا فریب | چرخ کے پہنائے جاذب کا فریب
مہر ہو کر ماہ پاروں سے طلب | نور کی تجھ کو ستاروں سے طلب !!
دوسروں کا نقش دل پر لکھ لیا | خاک لے کر ہاتھ سے دی کیمیا
نور ہے تیرا فروغِ مستعار | دوسروں کا نشہ اب سر سے اتار
شمع محفل کا ہے کیوں پروانہ تو | سوز سے اپنے ہے کیوں بیگانہ تو
اپنے ہی پردوں میں رہ مثلِ نظر | اڑ حدوں میں اپنی اڑنا ہے اگر
اس طرح اغیار سے کر اجتناب | خود ہی خلوت خانہ بن مثلِ حباب
فرد بھی ہے ایک شے اپنی جگہ | قوم لیکن قوم ہے اپنی جگہ
مصطفےٰ کے حکم سے آگاہ ہو | بے نیاز ربط غیر اللہ ہو

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

قوم ہے تیری ورائے رنگ و خوں | ایک اسود ہے صد احمر سے فزوں

ایک قنبر کے وضو کا قطرہ بھی ‏ ‏ ‏ ‏ خونِ قیصر سے کہیں ہے قیمتی

فارغِ اُمّ و اب و اعمام[1] رہ ‏ ‏ ‏ ‏ مثلِ سلماں زادۂ اسلام[2] رہ

نکتہ یہ اے ہمدم فرزانہ جان ‏ ‏ ‏ ‏ شہد کو عزلت گزیں لانہ[3] جان

کوئی قطرہ لالہ ٔ حمرا کا ہو ‏ ‏ ‏ ‏ یا وہ قطرہ نرگس شہلا کا ہو

کیا کہے گا وہ کہ میں عبہر[4] کا ہوں؟ ‏ ‏ ‏ ‏ یا کہے گا وہ کہ نیلوفر کا ہوں؟

ملّت اپنی شانِ ابراہیم ہے ‏ ‏ ‏ ‏ شہد کیا؟ ایمانِ ابراہیم[5] ہے

گر نسب کو جزوِ ملّت کر دیا ‏ ‏ ‏ ‏ رخنہ اندازِ اخوّت کر دیا

رشتۂ ملّت میں کیا تیرا سوال ‏ ‏ ‏ ‏ نا مسلماں ہے ابھی تیرا خیال

ابنِ مسعودؓ[6] آنِ عشق، ایمانِ عشق ‏ ‏ ‏ ‏ جسم و جاں ہیں ان کے سوزِ جانِ عشق

بھائی کے مرنے کا اتنا غم ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ سوزِ آہ غم سے سینہ جل گیا

جانتے تھے ان کو وہ جاں کی طرح ‏ ‏ ‏ ‏ روئے ان کی موت پر ماں کی طرح

---

۱ اعمام- جمع عم یعنی چچا ۲ سلمان فارسیؓ سے پوچھا گیا کہ ان کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا "سلمان ابن اسلام"، مولانا جامی فرماتے ہیں ؎ بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی ؛ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست ۳ لانہ- شہد کا چھتہ ۴ بشان- عبہر- نرگس ۵ ز اتفاقِ مگس شہد می شود پیدا ؛ خدا چہ لذت شیریں در اتفاق نہادہ

ان کی وجہ گریہ لیکن اور تھی — بات ہی کچھ اور زیرِ غور تھی

ان کو کہتے تھے "سبق خوانِ نیاز" — اور اپنا "ہم دبستانِ نیاز"

رو کے کہتے تھے "وہ ساتھی اٹھ گیا — جو مرا عشقِ نبیؐ میں یار تھا

وہ ہوا محرومِ دربارِ نبیؐ — میں ابھی ہوں محوِ دیدارِ نبیؐ

ہاں ہمیں روم و عرب سے کام کیا — بندشِ نام و نسب سے کام کیا

ہم ہیں محبوبِ حجازی پر فدا — اپنی یکجائی کی ہے بس یہ بنا

اپنا رشتہ ہے تولّائے نبیؐ — اپنا نشہ کیفِ صہبائے نبیؐ

ہے ہمارے خون میں مستی یہی — ہم نے پائی اس سے تازہ زندگی

شانِ ملتِ جمعیّت ہے یہ — سربسر خونِ رگِ ملّت ہے یہ

اس کا حق جاں پر نسب کا جسم پر — عشق ہے یعنی نسب سے پختہ تر

عشق کے بندے النسب کو چھوڑ دے — فکرِ ایراں و عرب کو چھوڑ دے

بس یہی سمجھو کہ نورِ حق ہیں ہم[1] — ایک ہی مصدر کے سب مشتق ہیں ہم[2]

---

[1] لا [2] حدیث رسول کریمؐ کی طرف اشارہ ہے ۱۲ (کوکب)

نورِ حق کے واسطے کیا زاد و بود　　خلعتِ حق کے لئے کیا تار و پود
جو حدِ اقلیم وجد تک ہی رہیں　　لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ ان سے کیا کہیں

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُواً اَحَدٌ

بے نیاز دہر مسلم کیوں رہا؟　　اس بحق پیوستہ کی فطرت ہے کیا؟
لالۂ تنہا اگا جو کوہ پر　　دامن گلچیں کی اس کو کیا خبر
چھیڑ دے باد سحر جب آ کے راگ　　شعلہ بن جاتی ہے از خود اس کی آگ
آسماں چھوڑے نہ چھوڑا ہے اسے　　کوکبِ وامانده سمجھا ہے اسے
تابِ مہر اس کو جگانے آتی ہے　　شبنم اس کا منہ دھلانے آتی ہے
لَمْ یَکُنْ سے ہو ترا رشتا قوی　　تب صفت ہو قوم بیہمتا تری
جس کی ذات پاک واحد، لاشریک　　اس کا بندہ کب بنائیگا شریک
جس کو حاصل ہو جہاں پر برتری　　کیوں وہ مانے گا کسی کی ہمسری

خرقۂ لاتحزنوا ہے جسم پر
انتم الاعلون اس کا تاجِ سر

دونوں عالم اس کا بارِ دوش ہیں
بحر و بر پروردۂ آغوش ہیں

ہے یونہی برقِ جہندہ پر نظر
گر پڑے تو اس کو لے لے دوش پر

پیشِ باطل تیغ، پیشِ حق سپر
نہی و امر اس کے عیارِ خیر و شر

اس کی چنگاری ہے شعلوں کی مثال
اس کا جوہر زندگی کا ہے کمال

اس جہان ہاؤ ہو میں پے بہ پے
نغمہ پیرا اس کی ہی تکبیر ہے

اس کے عفو و عدل و احساں ہیں عظیم
قہر میں بھی ہے مزاج اس کا کریم

ساز اس کا بزم میں خاطر نواز
سوز اس کا رزم میں آہن گداز

باغ میں ہے بلبلوں کا ہم صفیر
ہو سرِ صحرا تو بازِ صید گیر

زیرِ گردوں اس کا گھبراتا ہے دل
چرخ کی خوگر ہے اس کی آب و گل

مرغِ جاں تاروں پہ ہے منقار زن
عصرِ عالم سے ہے ماتھے پر شکن

تجھ کو سیرِ اندیشۂ بیہودہ ہے!
بن کے کیڑا زیرِ خاک آسودہ ہے!!

خوار تو مہجوری قرآں سے ہے
تجھ کو شکوہ گردش دوراں سے ہے

مثل شبنم گر کے کیوں شرمندہ ہے
پاس تیرے جب کتاب زندہ ہے

خاک کا کب تک رہے گا یوں اسیر
مرغِ ناداں! اڑ کے ہو افلاک گیر

عرضِ حال بحضور رحمۃ اللعالمین ﷺ

اے کہ تو خود ہے شبابِ زندگی
تیرا جلوہ آفتابِ زندگی

یہ زمیں تجھ سے ہی سرافراز ہے
آسماں کو تیرے در پر ناز ہے

تجھ سے تابندہ ہے یہ عالم تمام
ترک و تاجیک و عرب تیرے غلام

ذات تیری افتخار کائنات
فقر ہے تیرا بہار کائنات

تو نے روشن کی ہے شمعِ زندگی
تو نے بندوں کو سکھائی خواجگی

تھے یہ سارے پیکرانِ آب و گل
بے ترے نابود مندی سے خجل

تیرے دم سے آگ کا پردہ اٹھا　　خاک کے تودوں سے آدم بن گیا

ذرّہ سورج کے مقابل آگیا　　یعنی اپنے زور سے واقف ہوا

تیرے رخ پر جب پڑی میری نظر　　تو ہوا ماں باپ سے محبوب تر

میرے دل میں آگ پھونکی عشق نے　　اور بھڑکے، خوش ہوں اس کے سوز سے

نالۂ مثلِ نے ہے اب سامانِ دل　　ہے یہ شمعِ خانۂ ویرانِ دل

اب غمِ پنہاں نہ کہنا ہے محال　　اب مرا خاموش رہنا ہے محال

اب کہاں وہ مسلم، اے فخرِ امم !　　پھر ہوا بتخانہ یہ بیت الحرم !!

ہوں منات و لات و عُزّیٰ یا ہبل　　ہر کوئی رکھتا ہے اک بت در بغل

کر دیا ہے شیخ نے کافر کو مات　　اس کے دل میں بس رہا ہے سومنات

توڑ کر رشتہ عرب سے حق پرست　　بادہ خانے میں عجم کے اب ہیں مست

عضو، برفابِ عجم سے شل ہوئے　　ولولے سب آنسوؤں میں حل ہوئے

موت سے ڈرتا ہے کافر کی طرح　　دل ہے واماندہ مسافر کی طرح

اب وہ ذوقِ مرگ جینے میں نہیں
قلبِ زندہ اس کے سینے میں نہیں

نام کے چارہ گروں سے اس کی لاش
چھین لایا ہوں میں اب، اے حق شناس

آج تک میں نے جہاں تک ہو سکا
اس کو سمجھائے رموزِ مصطفےٰ

مردے کو دی آبِ حیواں کی خبر
گوش زد کی سرِّ قرآں کی خبر

لکھدیا افسانۂ یارانِ نجد
پیش کردی نکہتِ بستانِ نجد

شمعِ روشن کی بہ اسرارِ حیات
قوم کو سمجھا دیا کارِ حیات

کہتے ہیں افرنگ کا جادو ہے یہ
اس کے لب پر اُس کی ہاؤ ہو ہے یہ

بخشنے والے بصیری[1] کو ردا
مجھ کو دی ہے تو نے سلمیٰ کی نوا

ذوقِ حق دے اس خطا اندیش کو
غیر سمجھا ہے متاعِ خویش کو

ہاں اگر مجھ میں ہی کچھ جوہر نہیں
غیرِ قرآں کہدیا ہو کچھ کہیں

پر ضیا ہے تجھ سے ہر نزدیک دور
تجھ سے چھپتا ہے کہیں مافی الصدور

(۱) بصیری۔ مصنف قصیدہ بردہ جس نے عالم رویا میں نبی کریمؐ کو اپنا مشہور قصیدہ (امن تذکر جیران بذی سلم الخ) سنایا۔ حضورؐ نے اس کے صلے میں خوش نصیب بصیری کو اپنی ردائے پاک عطا فرمائی ۱۲ (کوکب)

پردۂ تخئیل میرا چاک کر — گلشنِ ہستی کو مجھ سے پاک کر

کر فنا مجھ کو اگر ہوں پر خطا — اہلِ ملّت کو مرے شر سے بچا

سبز میری کشت بے ساماں نہ کر — مجھ پہ کارِ بخششِ نیساں نہ کر

رس نہ رہ جائے مرے انگور میں — زہر بھر میری مئے کافور میں

خوار ہی رکھنا مجھے روزِ حساب — بوسۂ پا سے نہ کرنا بہرہ یاب

دُر اگر اسرارِ قرآں سے چنے — اور مسلمانوں کے دامن بھر دیئے

قوم سے جو کچھ کہا وہ حق کہا — کچھ نہ قرآں کے سوا مطلق کہا

کر مرے حق میں بس اتنی سی دعا — یہ دعا ہے میری محنت کا صِلا

عرض کر پیشِ خدائے عزّ وجل — علم ہو میرا ہم آغوشِ عمل

دولت جاں حزیں بخشی مجھے — اور نعمت علمِ دیں کی دی مجھے

کر عمل میں بھی مجھے پائندہ تر — آبِ نیساں سے مجھے کردے گہر

دہر میں جس روز سے آیا ہوں میں — اک تمنّا اور بھی رکھتا ہوں میں

ہے مرے سینے میں دل کی طرح — صبح سے ہے شام منزل کی طرح

نام جب سے لب پہ آیا ہے ترا — سوز مجھ کو اس تمنّا کا ملا

بڑھتا جاتا ہوں میں جوں جوں عمر میں — اور لیتی ہے یہ دل میں کروٹیں

ہوتی جاتی ہے جواں یہ آرزو — تیز تر پاتا ہوں اس میں رنگ و بو

یہ مجھے اک گوہر نایاب ہے — میری راتوں کا یہی مہتاب ہے

مدتوں لالہ رخوں میں میں رہا — عشق بھی عشوہ طرازوں سے کیا

بادہ نوشی ماہ سیماؤں میں کی — عاقبت کی فکر ہی دل میں نہ تھی

گردِ حاصل بجلیاں رقصاں رہیں — رہزنوں نے دل کی کانیں لوٹ لیں

لیکن اک قطرہ نہ اس مے کا بہا — یہ گلِ رنگیں نہ دامن سے گرا

عقل نے بھی دام پھیلائے بہت — رنگ، اس کے نقش بھی لائے بہت

ایک مدّت شک میں گزری زندگی — یہ خرابی ذہن سے جاتی نہ تھی

واسطہ علم الیقیں سے کچھ نہ تھا — تھا گماں آبادِ حکمت میں پڑا

میری ظلمت تابِ حق سے دور تھی
شامِ غم نورِ شفق سے دور تھی

یہ تمنّا دل میں خوابیدہ رہی
سیپ میں دُر بن کے پوشیدہ رہی

آخر آنسو بن کے ٹپکی آنکھ سے
دل میں اس نے زمزمے پیدا کئے

دل ہے پُر اب صرف تیری یاد سے
لب پہ لے آؤں اگر تو اِذن دے

زندگی ہی جب عمل ساماں نہ تھی
یہ تمنّا بھی مجھے شایاں نہ تھی

شرم آتی تھی مجھے کہتے ہوئے
بڑھ گئی جراءت ترے الطاف سے

شانِ رحمت ہے تری عالم نواز
آرزو ہے میرا مدفن ہو حجاز

ایک مسلم، ماسوا سے اجنبی
حیف ہے مٹی نے بتخانے کی

نزع میں جب پتلیاں اسکی پھریں
لے زمینِ دہر اس کو گود میں

بعدِ مردن گر وہاں تربت ملے
اس کشاکش سے مجھے فرصت ملے

تیرے در سے جب قیامت کو اٹھوں
غیر ممکن ہے کہ میں نازاں نہ ہوں

تو جہاں تھا کیا مبارک شہر ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کی لہر ہے

تو جہاں آرام فرما ہے وہ خاک
دیدۂ عشاق میں ہے جاں پاک

مسکنِ محبوب ہے رشکِ چمن
عاشقوں کو ہے یہی حُبّ الوطن

قبر میری بن کے جب تیار ہو
اس پہ تیرا سایۂ دیوار ہو

یہ تڑپ نکلے دلِ بیتاب سے
بیقراری جائے اِس سیماب سے

پھر کوئی دیکھے مرے آرام کو
اُس خراب آغاز کے انجام کو